

پارہ ہفتم

علامہ قاضی عبدالنبی کوکب



فقیہ عظیم پسرلی کیشنر
دارالعلوم حنفیہ سرمدیہ بصیرتویہ (اوکاڑا)

کتاب تصنیف
 علامہ قاضی عبدالنبی کوکب 98178
 یادِ شہید
 حروف سازی - نوری کمپوزنگ سنٹر، بصیر پور شریف
 کمپیوٹر کوڈ - NOOR\KOKAB.INP
 سنہ تصنیف ۱۹۵۹ء
 اشاعت بار اول - اپریل ۲۰۰۰ء
 اشاعت بار دوم - نومبر ۲۰۱۰ء
 صفحات 160
 مطبع اشتیاق ایے مشتاق پرنٹرز، لاہور
 ناشر فقیر اعظم پبلی کیشنز، بصیر پور شریف ضلع اوکاڑا

ISBN 969-9079-22-3



978 969 9079221>

سٹاکسٹ

- ① انجمن حزب الرحمن، بصیر پور شریف، ضلع اوکاڑا
- ② ضیاء القرآن پبلی کیشنز، گنج بخش روڈ، لاہور
- ③ فرید بک سٹال، 38- اردو بازار، لاہور
- ④ شبیر برادرز، 40- اردو بازار، لاہور
- ⑤ مکتبہ غوثیہ، بابا جلال بلڈنگ، یونیورسٹی روڈ، کراچی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
 اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی بَیِّنٰنَا وَ مَوْلٰنَا مُصَدِّقًا وَعَلٰی
 اٰلِ بَیِّنٰنَا وَ مَوْلٰنَا مُصَدِّقًا کَمَا تُحِبُّ وَ تَرْضٰی لَهٗ
 اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَ بَلِّغْ عَلٰی بَیِّنٰنَا وَ مَوْلٰنَا مُصَدِّقًا وَعَلٰی
 اٰلِ بَیِّنٰنَا وَ مَوْلٰنَا مُصَدِّقًا بِعَدَدِ کُلِّ مَعْلُوْمٍ لَّکَ

شرف انتساب

میں اپنی اس تالیف کا انتساب اپنے استاذ محترم الشیخ الفقیہ
 علامہ مفتی احمد یار خاں صاحب نعیمی مدظلہ العالی کے اسم گرامی
 سے کرتا ہوں، جن کے فیض تربیت سے میں اس قابل ہوا کہ
 کچھ پڑھ سکوں اور کچھ لکھ سکوں۔۔۔

آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
 آیا بود کہ گوشہ چشمی بہ ما کنند

کوکب، گجرات

۱۹۵۹ء

مندرجات

۹	تقدیم
۱۷	میرا مقصد
۱۹	سیرت طیبہ
۲۱	ابتدائی حالات
۲۱	ولادت
۲۳	آغوش رسالت
۲۶	نرالی تربیت

۲۷	عہد خلافت میں
۳۰	سیرت
۳۰	ذوق عبادت
۳۲	مجاہدانہ بسالت
۳۳	علم و فضل
۳۲	گفتگو، خطابت اور تحریر
۳۵	اخلاق و خصائص
۳۹	صفات عالیہ
۵۷	تاریخ کربلا
۵۹	مدینۃ النبی (ﷺ) سے فرات کے کنارے تک
۵۹	مطالبہ بیعت
۶۰	بھائی کا مشورہ
۶۰	روضہ رسول ﷺ پر دعائے مانگی
۶۱	مدینہ سے کوچ
۶۱	امام حسین رضی اللہ عنہ شعب ابی طالب میں
۶۳	عمرو بن عبدالرحمن
۶۳	عبداللہ بن عباس
۶۳	عبداللہ بن زبیر
۶۸	پہلی تقریر
۷۱	دس محرم تک

- ۷۲ ابن زیاد کا آرڈر
- ۷۳ ایک غلط فہمی کا ازالہ
- ۷۴ ابن زیاد کا آخری آرڈر
- ۷۵ جنگ کی وارننگ
- ۷۵ دسویں رات
- ۷۵ ساتھیوں کے ولولے
- ۷۷ خیمہ میں بہن اور بھائی کا مکالمہ
- ۷۷ بہن کو وصیت
- ۷۹ آخری صبح
- ۸۱ علی اکبر
- ۸۷ ریگ کر بلا سے تخت دمشق تک
- ۸۸ لب مبارک پر چھڑی ماری گئی
- ۹۱ کر بلا کا انتقام
- ۹۳ یزید
- ۹۴ مختار ثقفی
- ۱۰۱ شبہات اور ان کے جوابات
- ۱۰۳ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا موقف کیا تھا؟
- ۱۰۴ یزید کی حکومت
- ۱۰۷ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا موقف
- ۱۱۴ آپ کی بصیرت

۱۱۸	سفر کوفہ
۱۲۵	چند دیگر سوالات
۱۲۶	شہادتِ مسلم کی خبر ملنے کے بعد؟
۱۲۸	شہادت تک نوبت کیسے پہنچی؟
۱۳۹	شہداء کی یاد منانے کا طریقہ
۱۴۱	شہید کی محبت
۱۴۱	یاد منانا
۱۴۵	یادِ شہداء اور قرآن
۱۵۳	سانحہ کربلا اقبال کی نظر میں

تقدیم

نواسہ رسول، جگر گوشہ بتول، حیدر کرار کے عظیم فرزند، ملت اسلامیہ کے بطل جلیل، شہزادہ گلگوں قبا، سید الشہداء، امام عالی مقام، سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے اعلیٰ کلمۃ الحق اور شریعت محمدیہ کی بالادستی کے لیے معرکہ کربلا میں جو لازوال شہادت اور عظیم الشان قربانی پیش کی اور اپنے عزیز واقارب کے خون سے جوان مٹ نقوش ثبت کیے ہیں، تاریخ حریت اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔۔۔

معرکہ کربلا حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن ٹکڑھی۔۔۔ باطل اپنے تمام تر لاؤ لشکر کے ساتھ حق کے مقابل آیا، یزیدی فوجوں نے اپنی تلواروں کا رخ

قافلہ حسین کی جانب موڑ دیا اور وہ جملہ اسباب جن کا تعلق جبر و استبداد، تیر و تفنگ، نیزہ و سناں، حرص و ہوا اور دولت و ثروت سے تھا، وہ سارے کے سارے نظریہ حسین کے مخالف تھے اور وہ سب کچھ جس کا انحصار تقویٰ و طہارت، صبر و استقامت اور حق و دیانت سے تھا، وہ حسینی قافلہ کے پلڑے میں تھا۔۔۔ بظاہر میدان کربلا میں شمشیر و سناں کی فتح تھی، بدی کا غلبہ تھا اور حرص و ہوا کی کامیابی تھی۔۔۔ شہیدوں کی بکھری ہوئی لاشیں، اہل بیت کے خیموں میں سے لپکتے ہوئے آگ کے شعلے، پتہ ہوا صحرا، امام ہمام کی لاش کو گھوڑوں کا روندنا اور یزیدی لشکر کا طبل فتح بجانا۔۔۔ اس کے باوجود فاتح کون اور مفتوح کون تھا؟ اس کا فیصلہ تاریخ نے چھپا نہیں رکھا۔۔۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ یزید حرف غلط کی طرح مٹ گیا، خائب و خاسر ہو کر مرا اور حق سر بلند ہوا۔۔۔ برس ہا برس بیت جانے کے باوجود حسین کی جرأت و استقامت، وفا شعاری و راست بازی، دین حق اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے حقیقی طور پر سر دھڑکی بازی لگا دینے کے تذکرے ہوتے رہے ہیں۔۔۔ ہوتے رہیں گے۔۔۔ جب تک فلک نیلگوں پر ستارے جھلملاتے رہیں گے۔۔۔ جب تک سورج اپنی نقرئی کرنوں سے عالم پر ضو پاشی کرتا رہے گا۔۔۔ جب تک مؤذن کی اذان کی گونج سنائی دیتی رہے گی اور جب تک خدا اور رسول خدا (ﷺ) کا نام لیوا، ایک فرد بھی باقی رہے گا، ذکر حسین ہوتا رہے گا۔۔۔ نام حسین کا ورد لبوں پر جاری رہے گا۔۔۔ شہادت حسین کا تذکرہ اہل ایمان کو ایک نیا عزم اور ولولہ تازہ بخشتا رہے گا۔۔۔ اس لیے کہ وہ زندہ ہے، ان کا نام زندہ ہے، ان کا کردار زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔۔۔

اس محسن ملت اور شہید اعظم کی فقید المثال شہادت سے درس حاصل کرنے کی بجائے آپ کے تذکار شہادت کے بیان میں بے جا افراط و تفریط سے کام لیا گیا۔۔۔

ایک طبقہ نے اسے داستانِ غم کے طور پر لیا اور مقاصدِ شہادت کو سیاہ ماتی پردوں میں چھپا دیا۔۔۔ جب کہ دوسرے طبقہ نے تحقیق کے نام پر آپ کی تاب ناک شخصیت اور سنہری کارناموں کو کم سے کم تر دکھانے کی ناروا کوشش کی اور اس میں اس حد تک تعصب بلکہ بغض و کینہ سے کام لیا، گویا یزید کے وکیلِ صفائی اپنا مقدمہ پیش کر رہے ہوں۔۔۔

اس پس منظر میں ضرورت اس امر کی تھی کہ افراط و تفریط سے دامن بچا کر مستند اور ٹھوس مآخذ سے اصل حقائق پیش کیے جائیں۔۔۔ زیر نظر کتاب ”یادِ شہید“ اسی سلسلہ کی حسین اور خوب صورت کڑی ہے۔۔۔ فاضل مصنف قاضی عبدالنبی کوکب رحمۃ اللہ علیہ مایہ ناز ادیب، روشن فکر خطیب، عالی دماغ مفکر اور نکتہ رس عالم و محقق تھے۔۔۔ جو درسیات میں نعیمی مکتب فکر کے ممتاز شیخ، حکیم الامت مفتی احمد یار خاں نعیمی قدس سرہ العزیز کے تلمیذ رشید تھے، جب کہ دوسری طرف جدید علوم پر بھی مکمل دسترس رکھتے تھے۔۔۔

کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔۔۔ پہلے حصہ میں امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کے حالات طیبہ اور سیرت، دوسرے حصہ میں تاریخ کربلا (جس میں مدینۃ النبی سے ریگ زار کربلا اور معرکہ کربلا کے واقعات۔۔۔ منظر اور پس منظر) کا بیان ہے اور تیسرے حصہ میں ان اعتراضات کے جوابات دیے گئے ہیں، جو اس سانحہ کے حوالے سے بعض حلقوں کی جانب سے اٹھائے جاتے ہیں۔۔۔

محترم قاضی عبدالنبی کوکب کا اندازِ تحریر نہایت عمدہ، محققانہ اور علمی ہے۔۔۔ ”یادِ شہید“ پہلے پہل ۱۹۵۹ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی، عرصہ سے نایاب تھی۔۔۔ قاضی کوکب صاحب کے رفیق خاص علامہ احمد علی قصوری صدر مرکز اہل سنت پاکستان نے ازراہ کرم یہ گراں قدر کتاب عنایت فرمائی، جسے اب جدید انداز میں نتیہ اعظم پبلی کیشنز بصیر پور شریف (اوکاڑا) کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے۔۔۔ (زیر نظر نئے ایڈیشن میں

”سانحہ کربلا علامہ اقبال کی نظر میں“ کے عنوان سے علامہ قاضی عبدالنبی کوکب صاحب کا ایک فکر انگیز مضمون شامل کیا جا رہا ہے (امید کہ اہل بصیرت اور اہل محبت اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔۔۔)

آج کے پُر آشوب دور میں بطور خاص اس امر کی ضرورت ہے کہ واقعہ کربلا کا مطالعہ کیا جائے اور اس کی روح کو سمجھا جائے۔۔۔ کیوں کہ شہادت حسین اہل ایمان کو نئے نئے ولولہ سے سرشار کرتی ہے۔۔۔ تاریخ اسلام کی یہی وہ لازوال داستان ہے جو ”سادہ و رنگین“ ہونے کے باوصف رہتی دنیا تک حریت فکر اور حق کی سر بلندی رکھنے والے افراد کو باطل قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اور شوق فراواں عطا کرتی رہے گی۔۔۔ کاش امت مسلمہ اس ”داستانِ حرم“ سے درس حاصل کرتی اور اس کی روح کو سمجھتے ہوئے، باطل اور طاغوتی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتی رہے۔۔۔ مگر مسلمان باہم دست بہ گریبان ہیں۔۔۔ عالم اسلام بالعموم اور پاکستان بالخصوص اس وقت جن نازک اور سنگین حالات سے گزر رہا ہے، وہ کسی بھی صاحب بصیرت سے مخفی نہیں ہیں۔۔۔ امت مسلمہ، یہود و ہنود اور نصاریٰ کی جن سازشوں کا شکار ہے اور سی ٹی بی ٹی اور نیو ورلڈ آرڈر کی صورت میں اسے جس ”نارِ نمرود“ اور ”معرکہ کربلا“ کا سامنا ہے، اس کا حل صرف اور صرف اسوۂ خلیل (ﷺ) اور جذبہ شہیر کو زندہ رکھنے اور دل و جان سے اس پر عمل پیرا ہونے میں مضمر ہے۔۔۔

ریگ زار کربلا آج بھی ذلت و نکبت کی شکار، خوابیدہ امت مسلمہ کو زبان حال سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کر رہا ہے۔۔۔

قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

ادارہ ”فقیہ اعظم پبلی کیشنز“ بہزار خلوص و نیاز یہ گلدستہ عقیدت و محبت پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔۔۔

اللہ تعالیٰ جل و علا امت مسلمہ کو اسوۂ حسین پر گامزن ہونے کی توفیق ارزانی فرمائے۔۔۔

آمین بجاہ سید الکونین جد الحسن و الحسین

صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ اجمعین

من لدنا یومنا هذا الی یوم الدین

(صاحبزادہ) محمد محبت اللہ نوری

بصیر پور شریف

مدیر اعلیٰ ماہ نامہ نور الحیب

۲۱ رزوالحجۃ المبارکہ ۱۴۲۰ھ

مہتمم دارالعلوم حنفیہ فریدیہ

۲۸ مارچ ۲۰۰۰ء

استقامت کا نیا درس زمانے کو ملا
جب سرکرب و بلا ان صلی علیہ وسلم کا نواسہ رضی اللہ عنہ اترا

[راجا رشید محمود]

یاد شہید

غریب و سادہ و پرتگین ہے داستانِ حرم
 نہایت اس کی حسین، ابتدا ہے اسماعیل

[علامہ اقبال]

میرا مقصد

الحمد لله ولي الفضل و الانعام
 و السلام على حبيبه خير الانام
 و على آله الكرام و صحبه العظام
 اعوذ بالله من الشيطان الرجيم
 بسم الله الرحمن الرحيم

اس تالیف سے میرا مقصد یہ ہے کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے متعلق تین چیزیں
 ایک ہی کتاب میں جمع کر دی جائیں:

- ① آپ کے حالات زندگی اور سیرت
- ② کربلا کی تاریخ اور
- ③ مختلف مکاتب فکر کے خدشات و اعتراضات سے بحث اور ان کا ازالہ

سیرت کے بیان میں یہ امر ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے کہ امام موصوف کی زندگی کے ابتدائی ایام پر متعدد پہلوؤں سے روشنی ڈالی جائے تاکہ ان اسباب و موجبات تک ہر شخص کی نظر پہنچے جو سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی ذات میں صحیح اسلامی سیرت اور ایک مضبوط کریکٹر کی تخلیق کر رہے تھے۔ کربلا کے واقعات میں ایک طرف صحیح اور مستند معلومات درج کرنے کے لیے اصل ماخذ (مثلاً کامل ابن اثیر، تہذیب التہذیب، الاستیعاب اور صحاح احادیث وغیرہ) کو دیکھا گیا ہے اور دوسری طرف واقعاتی ترتیب میں ایک سلیقہ اور نکھار سا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ پڑھنے والا نہ الجھے اور نہ اکتائے۔۔۔

اعتراضات کی بحث میں ان غلط فہمیوں کو دور کرنا مقصود ہے، جو واقعات کی صحیح تصویر کو گدلا کرنے اور نیز امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کے مشن ہی کو نگہ سے اوجھل کر دینے کا باعث بنتی ہیں۔۔۔

میری دعا ہے کہ رب عالم جل جلالہ اس کوشش کو قبول فرمائے۔۔۔ آمین

تو کلت علی اللہ

و علیہ فلیتوکل المتوکلون

عبدالنبی کوکب

سیرت طیبہ

در نوائے زندگی سوز از حسین
اہلِ حق حریت آموز از حسین

[علامہ اقبال]

ابتدائی حالات

ولادت

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ ۵ شعبان المعظم ۴ھ، مطابق ۵ جون ۶۲۶ء کو مدینہ النبی میں پیدا ہوئے۔ جب آپ کی ولادت کی خوش خبری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی، تو آپ فوراً زہراء جنت رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لائے اور فرمایا:

”میرا پارہ جگر، میری گود میں دو“۔۔۔

نہے حسین (رضی اللہ عنہ) ایک پاکیزہ کپڑے میں لپیٹ کر حضور ﷺ کی آغوش میں رکھ دیے گئے۔ آپ ﷺ نے پیارے بچے کے کانوں میں اذان اور اقامت کہی۔۔۔ شروع میں حضرت امام حسین (رضی اللہ عنہ) کی شیر خواری، حضرت ام الفضل کے سپرد کی گئی، کیوں کہ سیدہ زہراء (رضی اللہ عنہا) کی گود میں ابھی حضرت حسن (رضی اللہ عنہ) دودھ پیتے تھے۔ ام الفضل، حضرت عباس (رضی اللہ عنہ) کی اہلیہ، یعنی رسول خدا ﷺ کی چچی تھیں۔ چند روز پیش تر یہی ام الفضل (رضی اللہ عنہا) حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کر رہی تھیں:

”حضور! میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا ہے کہ آپ کے جسم کا

ایک ٹکڑا کاٹ کر میری گود میں ڈال دیا گیا ہے“۔۔۔

حضور ﷺ نے فرمایا تھا:

”چچی! یہ تو بڑا اچھا خواب ہے“۔۔۔

چنانچہ حضرت امام حسین (رضی اللہ عنہ) کی پیدائش کے بعد حضور ﷺ نے انہیں ام الفضل (رضی اللہ عنہا) کی گود میں دے دیا اور اس طرح ان کا مبارک خواب پورا ہوا۔۔۔ حضرت حسین (رضی اللہ عنہ) کے عمیقے میں خود حضور ﷺ نے دو جانور ذبح کیے اور سر کے بال منڈوا کر ہم وزن چاندی خیرات کر دی۔۔۔

حضرات حسن و حسین (رضی اللہ عنہما) کس قدر خوش نصیب تھے کہ انہیں فاطمہ الزہراء (رضی اللہ عنہا) جیسی ماں نصیب تھی۔ آپ (رضی اللہ عنہا) ایک طرف چکی پستیں، کنویں سے مشکینزے بھرتیں اور دوسری طرف شہزادوں کا جھولا بھی جھولاتی رہتیں۔۔۔

اس گھر میں تربیت و تادیب کے طریقے بھی ساری دنیا سے نرالے تھے۔ ایک دن دونوں بھائی بچپن کے بھولے پن سے آپس میں لڑے اور پھر والدہ کے پاس شکایت لائے کہ مجھے بھائی نے مارا ہے، اس پر سیدہ فاطمہ (رضی اللہ عنہا) نے فرمایا:

98178

”مجھے اس بات سے کچھ غرض نہیں کہ حسین رضی اللہ عنہ نے مارا، یا حسن رضی اللہ عنہ نے، میں تو یہ جانتی ہوں کہ تم دونوں پر خداوند تعالیٰ ناراض ہو گیا ہے، کیوں کہ وہ لڑائی جھگڑے کو پسند نہیں کرتا“۔۔۔

یہ سن کر ننھے حسنین ملول ہو۔۔۔ رکھنے لگے:

”امی! اب معاف کر دیجیے، آئندہ ہم کبھی نہ لڑیں گے“۔۔۔

آپ بولیں:

”معافی اپنے خدا سے مانگو، چلو وضو کرو اور مصلے پر کھڑے ہو جاؤ“۔۔۔

چنانچہ پاک بچے، خدا کے دربار میں کھڑے ہو گئے۔۔۔ [۱]

آغوش رسالت

حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی عظمتوں کا راز یہ تھا کہ انہیں آغوشِ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی دولتِ عظمیٰ نصیب تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے انتہائی محبت رکھتے تھے، ہر روز انہیں دیکھنے کے لیے بیٹی کے گھر جاتے، انہیں اٹھا لیتے، ساتھ چمٹاتے، کھلاتے، پیار کرتے، چومتے اور کبھی یوں سونگھتے تھے، جیسے کہ پھولوں کو سونگھا جائے اور فرمایا کرتے:

هُمَا سَرِيحَانَتَايَ مِنَ الدُّنْيَا۔۔۔ [ترمذی]

”یہ دنیا میں میرے پھول ہیں“۔۔۔

بخاری و مسلم اور دوسری صحاح کی وہ حدیثیں کسے معلوم نہیں کہ ان بچوں کے لیے

[۱]..... یہ واقعہ، سیماب اکبر آبادی نے منظوم کیا ہے، میں نے ان کی نظم سے ہی لیا

ہے۔۔۔

حضور ﷺ خطبے کے منبر سے اتر آتے اور ان کے لیے سجدہ کو لمبا فرمادیتے، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ گواہ ہیں، آپ ﷺ فرمایا کرتے:

”یہ دونوں میرے بچے اور میری بیٹی کے لڑکے ہیں، اے اللہ! میں ان دونوں کے ساتھ محبت کرتا ہوں تو بھی ان دونوں سے اور ان کے ساتھ محبت رکھنے والوں سے محبت فرما“ --- [ترمذی]

احادیث کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے محبت نسبتاً زیادہ تھی ---

ایک مرتبہ آپ ﷺ، سیدہ رضی اللہ عنہا کے گھر کے پاس سے گزر رہے تھے کہ کان میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے رونے کی آواز پڑی، حضور ﷺ بے قرار ہو کر رک گئے اور بیٹی کو آواز دی:

”فاطمہ! کیا تم نہیں جانتی کہ اس کے رونے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے“ ---

ایک دن سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ دربار رسالت میں حاضر ہوئے، دیکھا کہ حضور ﷺ کے کندھے پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ سوار ہیں، سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بولے:

نِعْمَ الْمَرْكَبُ ---

”کیا اچھی سواری ہے“ ---

حضور ﷺ نے فرمایا:

وَنِعْمَ الرَّايِبُ ---

”اور سوار بھی تو بہت اچھا ہے“ ---

حضرت ام الفضل نے ایک موقع پر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو ذرا سختی اور عجلت

سے گود میں لیا۔ حضور ﷺ سے نہ رہا گیا، فوراً فرمایا:

مَهْلًا يَا أُمَّ الْفَضْلِ مَهْلًا ---

”اے ام فضل! بچے کو چھوڑ دو“ ---

اصابہ اور الاستیعاب میں آیا ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ أَبْصَرْتُ عَيْنَايَ هَاتَانِ وَ سَمِعْتُ أذْنَائِي
رَسُولَ اللَّهِ ﷺ وَ هُوَ أَخِذٌ بِكَفِّي حُسَيْنٍ وَ قَدَمَاهُ عَلَى قَدَمِ
رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَ هُوَ يَقُولُ تَرَقُّ تَرَقُّ عَيْنٌ بَقِيَهُ قَالَ فَفَرَّقِي
الْغُلَامَ حَتَّى وَضَعَ قَدَمَيْهِ عَلَى صَدْرِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ ثُمَّ قَالَ
لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَانْ فَانْ ثُمَّ تَفَلَّ ثُمَّ قَبَّلَهُ ثُمَّ قَالَ اللَّهُمَّ أَحِبَّهُ
فَإِنِّي أَحِبُّهُ ---

[اصابہ ابن حجر عسقلانی، الاستیعاب، جلد ۱، صفحہ ۵-۱۴۴]

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میری ان آنکھوں نے دیکھا اور

کانوں نے سنا کہ حضور سرور عالم ﷺ، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں کو

پکڑے ہوئے تھے اور حسین رضی اللہ عنہ کے پاؤں، حضور ﷺ کے پاؤں پر

رکھے تھے اور رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے:

اے ننھے قدموں والے! چڑھ آ چڑھ آ، چناں چہ بچہ جسم اطہر پر

چڑھنے لگا، یہاں تک کہ اپنے قدم حضور ﷺ کے سینے پر رکھ دیے۔

پس آپ نے فرمایا:

منہ کھول --- پھر آپ نے لعاب دہن ڈالا اور منہ چوم لیا، پھر فرمایا:

اے اللہ! اسے محبوب رکھ کہ میں اسے محبوب رکھتا ہوں“ ---

نزالی تربیت

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو کسی مدرسے یا تربیت گاہ میں جانے کی کیا حاجت تھی جب کہ خود ان کے نانا صلی اللہ علیہ وسلم معلم کائنات تھے۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم، پیارے نواسوں کو اکثر ساتھ رکھتے، گھر میں نماز پڑھتے وقت انہیں قریب کر لیتے، بعض اوقات دعوت پر ساتھ لے جاتے، اس طرح بچوں کی ہر ادا کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم مطالعہ فرماتے اور جب ضرورت ہوتی تو ہدایت بھی فرماتے تھے۔۔۔

ایک مرتبہ آپ کے پاس، زکوٰۃ کی کھجوروں کا ٹوکرا رکھا تھا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ آگئے، آپ بچے تھے، ایک کھجوراٹھا کر منہ میں رکھ لی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً انگلی ڈال کر کھجور نکال دی اور فرمایا:

کخ کخ --- [صحیح بخاری، جلد ۲، صفحہ ۱۲۹]
 ”پیغمبر کے گھر والے زکوٰۃ نہیں کھاتے“ ---

بعض روایات بتلاتی ہیں کہ ان بچوں کو نماز کا پورا طریقہ بھی خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی سکھایا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے کھیل کو بھی دلچسپی سے دیکھتے اور حوصلہ افزائی فرماتے تھے تاکہ جسمانی قوی بھی صحیح نشوونما پائیں۔۔۔

علامہ ابن حجر عسقلانی نے روایت کی ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ يَصْطَرِعَانِ
 بَيْنَ يَدَيْ رَسُولِ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم --- [اصابه، ابن حجر]

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، حسن و حسین رضی اللہ عنہما، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے سامنے کشتی لڑا کرتے تھے۔۔۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ قریش کے لکھنے پڑھنے والے لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ اپنے شہزادوں کو بھی لکھنا پڑھنا سکھاتے تھے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن و حسین رضی اللہ عنہما آپس میں خوش خطی کا مقابلہ کرتے اور حضور ﷺ کو دکھاتے، مگر آپ کسی ایک کے حق میں فیصلہ نہ دیا کرتے تھے تاکہ کسی کی دل شکنی نہ ہو۔۔۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے بچپن کے سات سال سات ماہ سات دن رسول خدا ﷺ کے سایہ شفقت میں گزارے۔ پھر حضور ﷺ کے انتقال کے بعد تربیت کی ذمہ داری سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے سنبھالی۔ آپ نے جہاں شہزادوں کو حکمت کے درس دیے، وہاں شمشیر زنی، شہ سواری اور فتون جہاد میں بھی ماہر کر دیا۔۔۔

عہد خلافت میں

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے کہ ان کا ہر کام رسول خدا ﷺ کی ہدایت کے مطابق ہو، چنانچہ ان کی کوشش اور خواہش تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے گھر والوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔۔۔

جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ میں اہل بیت پر اسی طریقے سے خرچ کیا کروں گا، جس طرح حضور ﷺ خرچ فرماتے تھے۔۔۔

خليفة دوم فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ رقمیں تقسیم فرماتے ہوئے حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو دس دس ہزار درہم دیے۔ اس پر خلیفۃ المسلمین کے صاحبزادے، عبداللہ بولے:

ان حضرات کو رقم زیادہ ملی ہے، حالاں کہ میری اسلامی خدمات زیادہ ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہایت برہم ہوئے اور فرمایا:

عبداللہ! تمہاری بات سے مجھے رنج ہوا، کیا تمہارا نانا، ان کے نانا کے مانند ہے؟ ---
کیا تمہاری ماں، ان کی ماں کے مانند ہے؟ --- کیا تمہاری نانی، ان کی نانی کے
مانند ہے؟ ---

سنو! ان کے نانا رسول اللہ ﷺ ہیں، ان کی والدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں اور ان کی نانی
حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ہیں ---

جب یمن کے بنے ہوئے حلقے مدینہ میں پہنچے اور سب لوگوں میں تقسیم ہو گئے۔
لوگ حلقے پہن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سلام کرنے مسجد کی طرف آ رہے تھے کہ حضرات
حسن و حسین رضی اللہ عنہما بھی تشریف لائے، مگر ان کے جسم پر کوئی حلقہ (قیمتی چغہ) نہ تھا۔
آپ نے بے قرار ہو کر فرمایا:

لوگو! تمہارے حلقے پہننے سے مجھ کو خوشی نہیں ہوئی کیوں کہ ان شہزادوں کے طفیل
تمہیں حلقے ملے ہیں لیکن ان کے جسم حلقوں سے خالی ہیں ---

اسی وقت حاکم یمن کو لکھا کہ دو قیمتی حلقے بھیج دو اور جب حسین کریمین رضی اللہ عنہما
وہ حلقے پہن کر نکلے تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرط مسرت سے فرمایا:
”اب مجھے سچی خوشی حاصل ہوئی ہے“ ---

ایک دن حضرت حسین رضی اللہ عنہ منبر نبوی کی طرف بے باکانہ بڑھے اور
حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے خطبہ کے دوران میں کہا:

”اے عمر! میرے نانا کے منبر سے اترو اور اپنے باپ کے منبر پر جاؤ“ ---

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:

”میرے باپ کا کوئی منبر نہیں اور یہ سب جو کچھ ہمیں ملا ہے، تمہارا اور

تمہارے نانا کا صدقہ ہے۔۔۔

پھر آپ شہزادے کو گھر لے گئے اور تاکید فرمائی کہ کبھی کبھی تشریف لایا کرو۔۔۔

[تہذیب التہذیب]

عہد عثمانی تک حسن و حسین رضی اللہ عنہما جوان ہو چکے تھے، چنانچہ اس زمانے میں

آپ نے اسلامی فتوحات میں حصہ لیا۔۔۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ جہاد طبرستان اور

افریقہ کی مہمات میں شریک ہوئے، تفصیل آگے آرہی ہے۔۔۔

سیرت

بچپن میں تربیت و تادیب کا جو پاکیزہ ماحول، سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کو میسر آیا تھا، اس نے آپ کی زندگی کو علم و فضل، شجاعت و بسالت، ہمت و عزیمت، تقویٰ و طہارت اور زہد و ورع کی صحیح اسلامی تصویر بنا دیا تھا۔۔۔

ذوق عبادت

آپ نے آنکھیں کھولیں تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم، سیدنا علی المر تقی اور سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا

کی نمازیں، تلاوتیں اور سجدے دیکھے۔۔۔ اس لیے یہ ذوق، زندگی کا ایک مستقل حصہ بن گیا:

لگا دی ہے مرے محبوب نے ایسی لگن مجھ کو
گزاروں گا اسی لذت میں باقی کی عمر اپنی
کبھی آپ پر ایسی حالت بھی آ جاتی تھی کہ پورا پورا دن اور ساری ساری رات نماز میں
گزار دیتے۔ ایسے موقعوں پر آپ دن رات میں ہزار ہزار رکعت پڑھ جاتے۔۔۔

[زین العابدین]

رات کی نماز میں جب تلاوت شروع کرتے تو آنکھیں آنسو برسائے لگتیں،
گلے میں آواز اٹکتی اور رک رک جاتی۔ جب قیام میں ہوتے تو تلاوت کی محویت میں
گھنٹوں کھڑے رہتے اور جب سجدے میں سر رکھتے تو لذت نیاز سے اٹھانے کو جی نہ چاہتا
اور اسی طرح راتیں تمام ہو جاتیں۔۔۔

الَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا۔۔۔ [الفرقان: ۶۴]

”جو کہ اپنے رب کے لیے سجدے کرتے ہیں اور قیام کرتے ہوئے،

راتیں گزار دیتے ہیں“۔۔۔

ذکر و عبادت کا یہ ذوق، مدینہ سے لے کر کوفہ تک کے اس سفر میں بھی نہ بھولا،
جو سفر کر بلا کہلاتا ہے اور جو آپ کی عمر میں آخری سفر تھا۔۔۔

۲۷ رجب المرجب ۶۰ھ کی رات کو جب آپ مدینہ طیبہ سے روانہ ہونے لگے
تو پہلے نانا جان رضی اللہ عنہ کے گنبد خضریٰ پر حاضر ہوئے۔ وہاں رات کا ایک حصہ ذکر و دعا
اور نانا جان رضی اللہ عنہ کے حضور میں عرض و مناجات کرتے گزارا۔ پھر فرات کے کنارے
پہنچ کر ۹ محرم الحرام ۶۱ھ کو جب دیکھا کہ دشمن جنگ شروع کرنا چاہتا ہے تو آپ نے

گھر کا ایک آدمی بھیج کر کوفیوں سے ایک رات کی اجازت لے لی، بس پھر یہ رات نمازوں، دعاؤں، استغفار و انابت اور عجز و تضرع کی رات تھی۔ ایک راوی کہتا ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ یہ آیت پڑھ رہے تھے:

مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ
الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ --- [آل عمران: ۱۷۹]

”خدا اہل ایمان کو اسی حالت میں نہ چھوڑ دے گا، وہ پاک کو ناپاک سے الگ کر دے گا“ ---

جعفر بن سلیمان کا بیان ہے کہ میں نے نو اور دس محرم کی درمیانی رات خیمے سے روشنی پھوٹی دیکھی اور جھانک کر دیکھا تو حضرت امام رضی اللہ عنہ کے سامنے قرآن حکیم کھلا ہوا ہے اور آپ تلاوت فرما رہے ہیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں ---

[تہذیب التہذیب]

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ یہ عمر کی آخری رات ہے، اس لیے انہوں نے چاہا کہ آج جی بھر کر اپنے خدا کی یاد کر لوں اور دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے، اسی کے ذکر کا زاد راہ لیتا جاؤں۔ زندگی کا یہ گوشہ وہ ہے، جہاں بندۂ مومن خدائے برحق کے حضور میں جھکا ہوا، اس کے سامنے اپنی طاعت و عبدیت کا اقرار کرتا ہوا نظر آتا ہے اور اس کا مظہر آپ نے اوپر کی سطروں میں دیکھا ---

مجاہدانہ بسالت

اب یہ ورق الٹ کر ان میدانوں کا نقشہ دیکھیے، جہاں باطل کی طاقتیں، حق سے

نکرانے کو اٹھ رہی ہوتی ہیں۔ یہاں حق کے پرچم کو سچائی کے وہ پروانے مطلوب ہوتے ہیں، جن کے جوش صداقت سے، طاغوت کا زہرہ آب ہوتا ہے اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ، وہی رات کی خاموشی میں اللہ کی یاد میں محور بننے والے حسین رضی اللہ عنہ، یہاں بھی شمشیر بدست میدانوں کی چھاتی پہ ٹہلتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہی سچے مومن کی زندگی ہے کہ وہ رات کا نمازی ہوتا ہے اور دن کا غازی ہوتا ہے۔۔۔

۳۰ھ / مطابق ۶۵۰ء کو عہد عثمان رضی اللہ عنہ میں طبرستان کی طرف جو فوجی مہم روانہ کی گئی تھی، حضرت حسین اور ان کے بھائی حضرت حسن رضی اللہ عنہما دونوں اس میں شریک ہوئے۔۔۔

[تاریخ الامم والملوک، طبری]

اسی طرح آپ ان مجاہدین میں بھی شامل تھے، جنہوں نے پہلے مصر فتح کیا اور بعد میں افریقہ کے میدانوں میں اتر کر اسلام کا پھریرا لہرایا۔ امام حسین رضی اللہ عنہ اپنے بھائی سمیت اسی لشکر میں کام کرتے ہوئے مغرب اقصیٰ تک پہنچے تھے۔۔۔

جب بلوایوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کر رکھا تھا، اس وقت آپ دونوں بھائی، ننگی تلواریں لیے ہوئے، خلیفۃ المؤمنین کے دروازے پر کھڑے تھے۔ چنانچہ فساد یوں کی فوج دروازے کی طرف سے آخر دم تک مکان میں داخل نہ ہو سکی مگر خلیفہ کی شہادت مقدر ہو چکی تھی، بلوائی پھیلی طرف سے دیوار پھاند کر اندر گھس گئے اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ ذی النورین رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے۔ خلیفہ کی شہادت کی خبر سنتے ہی، حضرت علی کرم اللہ وجہہ اللرمیم غم و غصہ سے بھرے ہوئے تشریف لائے اور صاحبزادوں کو تھپڑ مارتے ہوئے کہا:

”تمہارے ہوتے ہوئے یہ کیسے ہو گیا؟“۔۔۔

دونوں بھائی گوبے قصور تھے، تاہم والد کے سامنے اف تک نہ کی۔۔۔

حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں شامی لشکروں کے ساتھ، جو لڑائیاں وقتاً فوقتاً ہوتی رہیں، ان میں حضرت حسینؓ، اپنے والد ماجدؓ کے ساتھ نہایت پامردی اور دلیری کے ساتھ کام کرتے رہے۔ ۴۹ھ میں حضرت معاویہؓ نے ایک لشکر قسطنطنیہ کے لیے تیار کیا، اس میں بھی سیدنا امامؓ شریک ہوئے۔۔۔

جب آپ مجاہدین کے ساتھ میدان میں اترتے تو اپنے نانا جانؓ اور اپنے والد ماجد کی طرح، اگلی صفوں میں کھڑے ہوتے تھے۔ بلکہ آپ ان نڈر جوانوں میں سے تھے، جو عربی دستور جنگ کے مطابق عام لڑائی شروع ہونے سے پہلے، اکا دکا لڑائی کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتے تھے۔ ایک دفعہ جنگ میں آپ نے آگے بڑھ کر ”هل من مبارنا“ کا نعرہ بلند کیا (یعنی کوئی مقابلے پہ آئے)، مخالف سمت سے ایک بڑا معروف جنگ جوڑ برقان سامنے آیا، اس نے پوچھا:

”تم کون ہو؟“۔۔۔ آپ نے فرمایا:

”میں حسین بن علیؓ ہوں“۔۔۔ اس نے کہا:

میں آپ سے لڑنا نہیں چاہتا۔۔۔

ان سطور سے معلوم ہوگا کہ ہمارے ممدوح امام عالی مقامؓ، عابد شب زندہ دار بھی تھے اور شجاع دل غازی اور مجاہد بھی تھے۔۔۔

علم و فضل

رسول اللہؐ اور حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ الکریم کے فیضان تربیت کا تیسرا اثر یہ تھا کہ آپ میں فہم قرآن اور درایت حدیث کے جوہر پیدا ہو گئے تھے، اسی طرح

شعر و سخن کا بلند پایہ ذوق بھی رکھتے تھے۔ خود شعر کہتے بھی تھے اور عرب شاعری پر فاضلانہ نظر کے مالک بھی تھے۔ عربوں کی ذہین اور اعلیٰ سوسائٹی کے افراد کے لیے خطابت اور عربیت پر قدرت، نہایت لازمی چیزیں تھیں اور ان میں بھی سیدنا امام رضی اللہ عنہ کا مقام مسلم تھا۔۔۔

قرآن حکیم کے مضامین آپ کے ذہن پر اس قدر غالب تھے کہ آپ کی باتیں اور آپ کے خطبے قرآنی حقائق کی چاشنی سے لبریز ہوتے تھے۔ سفر کربلا کے دوران جب فرزدق نے بتلایا کہ ”کوفیوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں مگر ان کی تلواریں بنی امیہ کے ساتھ ہیں“۔۔۔ اور اس کے بعد فرزدق نے یہ فقرہ بولا:

وَالْقَضَاءُ يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَاللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ۔۔۔

”قضا و قدر آسمان سے نازل ہوتی ہے اور خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے“۔۔۔

تو جناب امام رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

صَدَقَتْ لِلَّهِ الْأَمْرُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَكُلَّ يَوْمٍ رَبُّنَا فِي شَانِ
إِنْ نَزَلَ الْقَضَاءُ بِمَا نَحِبُّ فَنَحْمَدُ اللَّهَ عَلَيَّ نِعْمَائِهِ وَهُوَ
الْمُسْتَعَانُ عَلَيَّ آدَاءِ الشُّكْرِ۔۔۔

”فرزدق! تم نے سچ کہا، معاملات اللہ ہی کے قبضے میں ہیں، جو وہ

چاہتا ہے، وہی ہوتا ہے۔ ہمارا پروردگار ہر لمحہ کسی حکم فرمائی میں ہے،

اگر مشیت ہماری پسند کے مطابق ہو تو اس کی حمد و ثنا کریں گے“۔۔۔

ان چند فقروں میں قرآن حکیم کے متعدد بنیادی تصورات آگئے ہیں اور پھر

ترکیبوں کی ساخت ایسی ہے کہ گویا قرآنی الفاظ کے نگینے، بلند پایہ عربی کی انگوٹھی میں

کمال صنعت سے جڑ دیے گئے ہوں اور جو کچھ فرمایا ہے، برجستہ اور بلا تکلف فرمایا ہے،

تاہم یہ کلام عربیت خالصہ کے عظیم القدر نمونوں میں سے ایک ہے، تقریباً آپ کی تمام گفتگوؤں اور تقریروں میں اسی مذکورہ انداز کا غلبہ نظر آتا ہے۔ بعض مواقع پر واقعات کی کیفیت کے مطابق صرف آیات قرآنی ہی پڑھ دیا کرتے تھے اور درپیش ہونے والے معاملے کی مکمل تصویر کھینچ جاتی تھی۔ ۲۷ رجب المرجب کو جب مدینہ منورہ سے نکلے تو یہ آیت کریمہ پڑھی:

فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ --- [القصص]

”پس اس بستی سے بحالت خوف و احتیاط نکلے“ ---

اور ۳ شعبان المعظم کو مکہ کے قریب پہنچتے ہوئے یہ پڑھ رہے تھے:

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسَىٰ رَبِّي أَن يَهْدِيَنِي سَوَاءَ

السَّبِيلِ --- [القصص]

”اور جب مدین کی طرف متوجہ ہوئے تو کہا، امید کہ پروردگار مجھے

سیدھی راہ دکھادے گا“ ---

اسی طرح جب آپ کے قاصد قیس بن مسہر کی شہادت کی خبر آپ تک پہنچی

تو آنکھیں تر ہو گئیں اور پڑھنے لگے:

فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَدُوا

تَبْدِيلًا --- [الاحزاب]

”پس ان میں کچھ وہ ہیں جو اپنا کام ادا کر چکے (یعنی جانیں قربان کر چکے)

اور کچھ باقی مہربان رہیں، انہوں نے چھ بدینتیں کی“ ---

یہ تمام اقتباسات کامل ابن اشیر، جلد ۴ سے لیے گئے ہیں اور یہاں سے اندازہ ہوتا ہے کہ

آپ قرآن کو کس قدر غائر نگاہی اور حضور ذہن کے ساتھ پڑھتے تھے کہ جب چاہتے،

موقع کے مناسب قرآن حکیم کی خوشہ چینی فرمالتے۔۔۔

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کو احادیث کے یاد کرنے اور ان کی اشاعت کرنے کا خاصہ شغف تھا۔۔۔ کتب حدیث میں آپ سے کئی روایات ایسی منقول ہیں، جو آپ نے خود حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھیں، اس کے علاوہ آپ نے علم حدیث کے سلسلے میں اپنے والد ماجد، اپنی والدہ محترمہ، اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہم کی شاگردی اختیار کی۔۔۔

حدیث سیکھنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق، آپ نے اسے دوسروں تک پہنچایا۔ چنانچہ جن حضرات نے آپ سے احادیث روایت کی ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

حضرت حسن بن علی، علی بن حسین، زید بن حسین، سکینہ بنت حسین،
فاطمہ بنت حسین، امام ابی جعفر باقر، امام شععی، حضرت عکرمہ، کرزیمی،
سنان بن ابی سنان دؤلی، عبد اللہ بن عمرو بن عثمان، فرزدق اور دیگر

بہت سے اصحاب۔۔۔ [تہذیب التہذیب، جلد ۲، صفحہ ۳۲۵]

اس فہرست میں ”سکینہ بنت حسین“ اور ”فاطمہ بنت حسین“ کے نام ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت امام گھر میں اپنی بچیوں تک کو احادیث یاد کراتے تھے اور امام ابو جعفر باقر، امام شععی، حضرت عکرمہ اور فرزدق جیسے اسماء، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے علمی پایہ پر دلالت کرتے ہیں کہ ایسے ایسے ارباب علم و فضل آپ کے خوشہ چینوں میں تھے۔۔۔

شعر و شاعری میں بھی خوب دلچسپی لیتے تھے لیکن صرف پاکیزہ اور باند مضمون اشعار کو پسند فرماتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کو عرب شاعری کا اکثر حصہ یاد تھا اور کبھی کبھی حسب مواقع اچھے شاعروں کے شعر اپنی گفتگو میں استعمال کرتے تھے۔ کربلا کی راہ میں

جب حرنے کہا:

”اگر آپ جنگ کریں گے تو قتل کیے جائیں گے“۔۔۔

تو آپ نے فرمایا:

میں تیرے جواب میں رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے وہ اشعار پڑھتا ہوں، جو انہوں نے جہاد پر جاتے ہوئے کہے تھے، جب کہ ان کا کافر بھائی انہیں روکتا تھا:

سَامُضِيٌّ وَمَا بِالْمَوْتِ عَارٌ عَلَى الْفَتَى

إِذَا مَا نَبِيٌّ خَيْرًا وَجَاهَدَ مُسْلِمًا

وَأَسَى رَجَالًا صَالِحِينَ بِنَفْسِهِ

وَخَالَفَ مَثْبُورًا وَخَارِقَ مُجْرَمًا

فَإِنْ عِشْتُ لَمْ أُنْدِمِ وَإِنْ مِتُّ لَمْ أَلْمُدْ

كَفَى بِكَ ذَلًّا أَنْ تَعِيشَ وَتُرْغَمَا

[ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۴۵]

”میں روانہ ہوتا ہوں، مرد کے لیے موت میں عار نہیں، جب اس کے عزائم

نیک ہوں اور وہ اسلام کے لیے جہاد کرنے والا ہو۔۔۔

اور جب نیکوں پر اپنی جان قربان کرنے والا ہو اور مجرموں سے

الگ ہو جانے والا ہو۔۔۔

پس اگر میں زندہ رہا تو ندامت نہ ہوگی اور اگر مر گیا تو ملامت بھی نہ ہوگی،

لیکن خواری کے ساتھ جینا سب سے بڑی ذلت ہے“۔۔۔

کبھی کبھی آپ خود بھی شعر کہتے، آپ سے جو اشعار منقول ہیں، وہ عربی شعر کے

اونچے درجے کا ایک حصہ ہیں۔ آپ نے دنیا کی حرص، مال اور فقر و غنی پر فرمایا ہے:

دَعِ الْجِرْصَ عَنِ الدُّنْيَا
 وَفِي الْعَيْشِ فَلَا تَطْمَعُ
 وَلَا تَجْمَعُ مِنَ الْمَالِ
 فَلَا تَدْرِي لِمَنْ تَجْمَعُ
 فَإِنَّ الرِّزْقَ مَقْسُومٌ
 وَسُوءُ الظَّنِّ لَا يَنْفَعُ
 فَقِيرٌ كُلُّ ذِي حِرْصٍ
 غَنِيٌّ كُلُّ مَنْ يَقْنَعُ

[مجموعۃ القصائد، صفحہ ۴۷]

”دنیا کی حرص اور زندگی کی لمبی امیدیں چھوڑ۔۔۔۔۔
 اور مال جمع کرنے میں ہی نہ لگا رہ، کیا خبر کس کے لیے جمع کر رہا ہے۔۔۔۔۔
 رزق کا فیصلہ تو ہو چکا اور بدگمانی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔۔۔۔۔
 فقیر وہ ہے جو طمع میں مبتلا ہے اور غنی وہ ہے، جو صاحب قناعت ہو۔۔۔۔۔
 چھوٹی بحر کے یہ اشعار، کس قدر آسان زبان اور دل کش انداز میں کہے گئے ہیں۔
 ممکن نہیں کہ عربی شعر کا ذوق رکھنے والا، انہیں جھومے بغیر پڑھ جائے۔۔۔۔۔
 آپ نے کچھ اشعار، جنت کے بارے میں کہے تھے، ان میں سے دو شعر یہ ہیں:

وَدَدُّهَا النُّورُ وَالْأَرْكَانُ مِنْ ذَهَبٍ
 وَالْفَرْشُ اسْتَبْرَقٌ خَضِرٌ حَوَاشِيهَا
 فَمَنْ يَرُدُّ شَرَاهَا مَعَ تَقَلُّبِهِ
 فَلَيْلَةٌ بِدَوَامِ الصُّبْحِ يُحْيِيهَا

”اس کے پردے نور کے اور ستون سونے کے ہیں۔ فرش استبرق کا ہے،

جس کے کنارے سبز ہیں۔۔۔

پس جو شخص اپنی تنگ دستی کے باوجود اسے خریدنا چاہے، وہ راتوں میں

صبح تک عبادت کیا کرے۔۔۔

صرف ایک ہی شعر میں ایک ایسی چیز کا نقشہ آنکھوں کے سامنے رکھ دیا ہے، جسے

کوئی آنکھ دیکھ نہیں سکتی اور کوئی کان سن نہیں سکتا۔۔۔

قیام کربلا کی آخری رات میں، جب آپ تلواریں صاف فرما رہے تھے، تو طبیعت نے

نیرنگی زمانہ پر یہ شعر موزوں کیے:

يَا دَهْرُ أَفِّ لَكَ مِنْ خَلِيلٍ
 كَمْ لَكَ بِالْإِشْرَاقِ وَالْأَصِيلِ
 مِنْ صَاحِبٍ أَوْ صَالِبٍ قَتِيلٍ
 وَالذَّهْرُ لَا يَقْنَعُ بِالْبَدِيلِ
 وَإِنَّمَا الْأَمْرُ إِلَى الْجَلِيلِ
 وَكُلُّ حَيٍّ سَأَلَكَ السَّبِيلِ

[ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۳۰]

”اے زمانے! تو کیا بے وفا دوست ہے، ہر صبح اور ہر شام، تیرے ہاتھوں

کتنے مارے جاتے ہیں۔۔۔

اور یہ زمانہ کسی سے عوض قبول نہیں کرتا۔۔۔

دراصل سارا معاملہ تو خدائے جلیل کے ہاتھ میں ہے اور ہر زندہ شخص

موت کی راہ پر چل رہا ہے۔۔۔

زمانے، زندگی اور خدا کے متعلق عرب شاعروں نے جو کچھ کہا ہے، وہ سارا ذخیرہ سامنے رکھیے اور پھر دیکھیے کہ کربلا کی خاموش راتوں میں گنگنانے والے شاعر کی ان صداؤں کا کیا مقام ہے؟ ---

آپ کی شاعری کے تذکرے کے آخر میں وہ غیر فانی اشعار درج کرتا ہوں، جو آپ کی زندگی کے آخری شعر ہیں اور جو تلواروں کی جھنکار میں پکارے گئے تھے۔ جب خاندان رسول ﷺ کے تمام بہادر کٹ چکے تھے اور آپ تن تنہا، دشمن کی صفوں میں اہل بیت کی شجاعت کی روایات دہرا رہے تھے، اس وقت آپ اپنا جنگی ترانہ یوں پڑھ رہے تھے:

أَنَا ابْنُ عَلِيٍّ الْخَيْرِ مِنْ آلِ هَاشِمٍ
 كَفَانِي بِهَذَا مَفْخَرًا حِينَ أَفْخَرُ
 وَجَدِّي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَكْرَمُ مِنْ مَشِي
 وَنَحْنُ سِرَاجُ اللَّهِ فِي النَّاسِ أَنْهَرُ
 وَفَاطِمَةُ أُمِّي سُلَالَةُ أَحْمَدَ
 وَعَمِّي يُدْعَى ذَالْجَنَاحَيْنِ جَعْفَرُ
 وَفِينَا كِتَابُ اللَّهِ أَنْزَلَ صَادِقًا
 وَفِينَا الْهُدَى وَالْوَحْيُ وَالْخَيْرُ يُذَكَّرُ

”میں اس علی (رضی اللہ عنہ) کا فرزند ہوں، جو بنی ہاشم میں بہترین تھے۔

نسبی فخر کے وقت، یہی بات میرے لیے باعث افتخار ہے۔۔۔

اور میرے نانا رسول خدا (ﷺ) ہیں، جو ساری خلق سے افضل ہیں

اور ہم لوگ انسانیت کے لیے روشن چراغ ہیں۔۔۔

اور میری والدہ، وہ فاطمہ (رضی اللہ عنہا) ہیں، جو رسول اللہ (ﷺ) کا
 جگر پارہ تھیں اور میرے چچا حضرت جعفر طیار ذوالجناحین رضی اللہ عنہ ہیں۔۔۔
 ہمارے گھر میں اللہ کی سچی کتاب نازل ہوئی اور ہمارے ہی گھرانے میں
 ہدایت، وحی اور نیکی کا چرچا رہتا ہے۔۔۔

گفتگو، خطابت اور تحریر

علم و فضل کی جو دولت، آپ نے اپنے گھرانے سے پائی تھی، اس کے اثرات
 آپ کی گفتگو اور تحریر و تقریر میں نہایت واضح نظر آتے ہیں۔ عربوں میں گفتگو اور
 مراسلے میں اختصار اور جامعیت کو پسند کیا جاتا تھا، لیکن تقریر اور خطبہ میں فصاحت و بلاغت،
 زبان دانی اور قادر الکلامی کے کمالات دکھائے جاتے تھے۔ اس معیار کو مد نظر رکھتے ہوئے،
 سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی گفتگوؤں اور ان کے خطبوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ
 زبان پر مکمل قدرت بلکہ حکومت حاصل ہونے کے ساتھ، آپ وقت کے ادبی معیار سے بھی
 آگاہ تھے۔ آپ کی عام گفتگو کا یہ عالم تھا کہ صرف چند لفظوں میں پورا مدعا اس طرح
 بیان فرما دیتے کہ اس پر ایک لفظ کا اضافہ بھی ناممکن ہوتا۔ مدینہ منورہ کے عامل نے
 جب آپ کو تنہائی میں بلا کر، بیعت کا مطالبہ کیا تو آپ کا جواب یہ تھا:

مِثْلُنَا لَا يُبَايِعُ سِرًّا۔۔۔ [الاستیعاب، جلد ۱، صفحہ ۱۴۴]

”ہم لوگ، خفیہ بیعت نہیں کر سکتے۔۔۔“

اس جواب پر، حاکم مدینہ لا جواب ہو گیا۔۔۔

کوفہ جاتے ہوئے، جب شہادت مسلم کی خبر آئی تو بعض ساتھیوں نے کہا،

اب واپس جانا چاہیے۔ لیکن حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کے بھائیوں نے کہا:
 ”نہیں بخدا، یا تو ہم انتقام لیں گے، نہیں تو ہم خود بھی شہید ہوں گے“۔۔۔

اس پر آپ نے اپنا فیصلہ، صرف ان الفاظ میں سنایا دیا:

لَا خَيْرَ فِي الْحَيَاةِ بَعْدَكُمْ --- [تہذیب العہذیب، صفحہ ۳۵۲]

”تمہارے بعد زندگی میں کچھ بھلائی نہیں“۔۔۔

میدان کربلا میں خیموں کی حفاظت کے لیے آپ نے حکم دیا کہ ارد گرد خندق کھود کر

اس میں آگ جلا دی جائے، جب آگ بھڑکی تو ایک کوئی بد بخت نے کہا:

تَعَجَّلَتِ النَّاسَ فِي الدُّنْيَا ---

”تم نے دنیا میں ہی آگ اختیار کر لی“۔۔۔

یہ طعنہ سن کر آپ نے فرمایا [۱]:

أَنْتَ أَوْلَىٰ بِهَا صِلِيًّا --- [کامل، صفحہ ۳۱]

”اس میں جلنے کے زیادہ مستحق تم ہو“۔۔۔

فرات کے کنارے پر آپ نے عمرو بن سعد کے ساتھ حالات پر گفتگو کرتے ہوئے،

اپنی تین اہم شرطیں پیش کی تھیں اور الفاظ صرف یہ تھے:

إِمَّا أَنْ تَدْعُونِي فَاذْهَبُ إِلَى يَزِيدَ وَإِمَّا أَنْ تَدْعُونِي فَاذْهَبُ

إِلَى يَزِيدَ وَإِمَّا أَنْ تَدْعُونِي فَاذْهَبُ مِنْ حَيْثُ

جُنْتُ --- [تہذیب، صفحہ ۳۵۲]

”یا مجھے سرحدوں کی طرف جانے دو یا مجھے یزید کے پاس پہنچنے دو

[۱]..... ”سعادت الکونین“ نے طبری کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس گستاخ کا گھوڑا کودا

اور اسے خندق میں گرا دیا، جہاں وہ جل کر راکھ ہو گیا۔۔۔

(تا کہ براہ راست گفتگو ہو سکے) اور یا مجھے واپس جانے دو۔۔۔

یہ تین فقرے تھے، لیکن عالم اسلام کی ساری کش مکش کا حل ان میں بند تھا۔
پھر مضمون کی اہمیت اور نزاکت کے باوجود، اسے کس قدر سادہ، سلیس اور مختصر الفاظ میں
ادا کر دیا گیا۔۔۔

اسی طرح آپ کے خطوط میں الفاظ بہت کم، معانی بہت زیادہ اور مطالب
نہایت واضح ہوتے تھے، آپ کے بعض خطوط کا متن آئندہ اجاث میں آ رہا ہے۔
خطابت عربوں کا محبوب وصف تھا، قریش اور خصوصاً بنو ہاشم میں ہمیشہ بھد پارہ خطیب
پیدا ہوتے رہے۔۔۔

امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کے لیے یہ وصف خاندانی وراثت کی حیثیت رکھتا تھا، حضرت
علی المر تضحی رضی اللہ عنہ کی خطابت تو مسلم تھی، پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی موثر خطیب تھے۔
ایک دفعہ آپ نے ایک ایسے مجمع سے خطاب فرمایا، جو حضرت علی المر تضحی رضی اللہ عنہ کی
پیروی سے ہٹنا چاہتا تھا مگر آپ کی تقریر کا اثر یہ تھا کہ ہزار ہا لوگ بیعت کرنے لگے اور
جہاد کے لیے تیار ہو گئے۔ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ بھی نہایت پر تاثیر اور مسکت [۱]
تقریر فرماتے تھے۔ آپ نے آواز بھی بلند پائی تھی اور انداز بھی خطیبانہ تھا۔۔۔

میدان کربلا میں دشمنوں کی قطاروں کے سامنے آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ! اِسْمَعُوا قَوْلِي وَلَا تَعْجَلُونِي حَتَّىٰ أَعْظِمَ بِمَا
يَجِبُ لَكُمْ عَلَيَّ وَحَتَّىٰ أَعْتَذِرَ إِلَيْكُمْ مِنْ مَقْدَمِي عَلَيْكُمْ فَإِن
قَبِلْتُمْ عَذْرَائِي وَصَدَّقْتُمْ قَوْلِي وَأَنْصَفْتُمُونِي كُنْتُمْ بِذَلِكَ

[۱]..... آپ کو فیوں کے سامنے تقریر کرتے، پھر سوال کرتے کہ ”کیا میں غلط کہتا ہوں“

لیکن ادھر سناٹا چھا جاتا تھا اور کوئی جواب نہ آتا تھا۔۔۔

أَسْعَدَ وَلَمْ يَكُنْ لَكُمْ عَلَى سَبِيلٍ وَإِنْ لَمْ تَقْبَلُوا مِنِّي الْعُذْرَ
فَاجْبِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرَكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً
ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تَنْظُرُونِ إِنَّ وَلِيَّيَ اللَّهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ وَ
هُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ --- [کامل، جلد ۴، صفحہ ۳۱]

”اے لوگو! میری بات سن لو، جلدی نہ کرو۔ مجھے نصیحت کرنے دو،
اپنا عذر کہنے دو، آمد کی وجہ بیان کرنے دو، اگر تم میری معذرت مان لو اور
میری بات کی تصدیق کرو اور میرے ساتھ انصاف کرو تو تم بڑے
خوش بخت ہو گے اور تم میری مخالفت سے باز آ جاؤ گے۔ لیکن اگر تم میری
معذرت قبول نہ کرو، تو پھر تم اور تمہارے ساتھی ایک کر لو، تمہارا معاملہ شبہ میں
نہ رہے، پھر مجھ پر ٹوٹ پڑو اور ذرا مہلت نہ دو۔ میرا والی وہ اللہ ہے،
جس نے قرآن اتارا اور وہی نیکوں کا حامی ہے۔“

ہر فقرے میں قرآن کے الفاظ جگمگا رہے ہیں، ہر ترکیب ”عَرَبِيٌّ مُبِينٌ“ کا
نمونہ پیش کر رہی ہے۔ فصاحت و بلاغت کی حد ختم ہو رہی ہے اور تاثیر کی بجلی،
تقریر کے گوشے میں چمک رہی ہے اور پھر یہ آواز اس خلیب کا ہے، جو منبر پہ نہیں
بلکہ موت کی بدلیوں میں گھر کر رہی تھوڑے پہ بیٹھا ہوا، گونج رہا ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دارورسن کی آزمائش ہے

اخلاق و خصائص

آپ کے اخلاق نہایت اعلیٰ اور عادات نہایت پاکیزہ و شائستہ تھیں کیوں کہ آپ

اس ہستی کی آغوش میں کھیلے تھے، جن کا مشن ہی انسان کے اخلاق و اطوار کو سدھارنا تھا۔
سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اپنے نانا جان کی طرح نہایت سخی اور غریب پر و رواقع ہوئے تھے۔
ایک دفعہ ایک تنگ دست بدوی مدینہ طیبہ میں آیا اور پوچھنے لگا:

اس شہر میں سب سے بڑا سخی کون ہے؟ --- لوگوں نے آپ کا پتہ دیا، جب سائل
دروازے پر پہنچا، آپ نے خادم سے کہا:

دیکھو تو گھر میں کتنی رقم ہے، اس نے عرض کی:

چار ہزار اشرفیاں --- فرمایا:

”سب اٹھا کر اس شخص کو دے دو، کیوں کہ یہ ہم سے زیادہ

ضرورت مند ہے“ ---

جو شخص احسان کرتا، اسے ہمیشہ یاد رکھتے اور اس کے احسان کا بدلہ ادا فرماتے۔

ایک دفعہ آپ، حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کے لیے
جا رہے تھے، راستے میں زادراہ ختم ہو گیا اور بھوک پیاس نے ستایا، اسی حالت میں
ایک بڑھیا کی جھونپڑی نظر آئی، چنانچہ آپ اس کی طرف بڑھے، بڑھیانے
اپنی بکری کا دودھ دوہ کر پیش کیا اور پھر وہی بکری ذبح کر کے کھانا تیار کیا۔ کھانے پینے سے
فارغ ہو کر آپ مکہ کو روانہ ہوئے اور حج سے فارغ ہو کر بعافیت تمام مدینہ واپس پہنچ گئے۔

کافی عرصہ گزر جانے کے بعد وہی بڑھیا اتفاق سے مدینہ منورہ آئی، امام حسین رضی اللہ عنہ
اور دوسرے بھائیوں نے بڑھیا کو پہچان لیا، چنانچہ ہزار ہزار بکری اور ہزار ہزار درہم
دے کر بڑھیا کو نہایت عزت و تکریم کے ساتھ رخصت کیا گیا ---

حضرت انس رضی اللہ عنہ بتلاتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت امام کے پاس بیٹھا ہوا تھا
کہ ایک کنیر نے پھولوں کا ایک گل دستہ لا کر پیش کیا، گل دستہ ہاتھ میں لے کر

حضرت نے سونگھا اور کنیر سے ارشاد فرمایا:

”جا تو اللہ کی راہ میں آزاد ہے“ ---

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے عرض کی:

”آپ نے ایک گل دستے پہ کنیر کو آزاد کر دیا“ ---

آپ نے فرمایا، قرآن کریم میں حکم ہے:

إِذَا حَيَّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا ---

”یعنی جب تمہیں اچھی چیز پیش کی جائے تو تم اس سے بھی اچھی

پیش کش کرو“ ---

آپ کی سخا منشی اور دریادلی کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات شاعروں کو بڑی بڑی رقمیں

عطا فرما دیا کرتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ کسی ایسے موقع پر آپ کے بڑے بھائی

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے آپ کی اس - - - پر تنقید کی اور ناراضگی ظاہر فرمائی کہ تم

خواہ مخواہ ان لوگوں کو انعام دیتے رہتے ہو، اس پر سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے کہا:

”بھائی جان! آپ مجھ سے اس حقیقت کو زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ اچھا مال

وہ ہے، جس کے ذریعے عزت کی حفاظت کی جائے“ ---

آپ کا مفہوم یہ تھا کہ ان کے منہ میں ٹکڑا دینا بہتر ہوتا ہے تا کہ برائی اور جھوٹ سے

ان کی زبان رکی رہے۔ خاندان کے تعلقات اور حقوق کا بہت زیادہ خیال رکھا کرتے تھے،

خاندان کے ہر چھوٹے بڑے فرد سے انتہائی محبت رکھتے تھے، یہی وجہ تھی کہ آپ

ہر صغیر و کبیر کی محبت کا مرکز تھے، گویا پورے خاندان کی روح رواں تھے ---

اس بات کا اندازہ سفر کر بلا سے بھی ہوتا ہے کہ گھر کا ہر چھوٹا بڑا، آپ کے ساتھ

جانیں نثار کرنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا اور راستے میں جب آپ کہتے کہ تم لوگ

اپنی جانیں بچا کر نکل جاؤ تو ان کا جوشِ محبت اور بھی ابھرتا اور وہ کہتے کہ آپ کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے۔۔۔

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ، اپنے بڑے بھائی حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا از حد احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ کوئی ایسی بات پیش آئی کہ بڑے بھائی کچھ رنجیدہ سے ہو گئے، ایک آدھ دن یونہی گزر گیا تو امام حسین رضی اللہ عنہ بہت مضطرب ہوئے، جی چاہا کہ بھائی کے پاس فوراً چلے جائیں، لیکن ایک حدیث پاک یاد آ گئی، جس کی رو سے خود رک گئے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہ پیغام بھیجا:

”میں آپ کو راضی کرنے کے لیے پہل کرنا چاہتا تھا مگر نانا جان کا فرمان یاد آ گیا ہے کہ جو شخص اپنے رنجیدہ بھائی کو راضی کرنے میں پہل کرتا ہے، وہ جنت میں بھی اس سے پہلے داخل ہوگا اور میں یہ بات پسند نہیں کرتا کہ جنت جانے میں آپ سے پہل کروں، کیوں کہ آپ بڑے ہیں لہذا آپ خود میرے ہاں تشریف لائیے۔۔۔“

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ یہ پیغام سنتے ہی چھوٹے بھائی کے پاس چل کر آ گئے اور دونوں بھائی فرطِ محبت سے ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ یہاں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کے سینے کس قدر صاف اور دل کیسے پاک تھے۔۔۔

راضی اللہ عنہم وراضوا عنہ

اپنے سوتیلے بھائی سیدی محمد بن الحنفیہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی بڑی محبت فرماتے تھے، جب مدینہ طیبہ میں بیعت کا مطالبہ شروع ہوا تو آپ نے پیش آمدہ حالات کے متعلق انہی سے مشورہ کیا اور پھر مکہ کی طرف روانگی ان کے مشورے کے مطابق عمل میں آئی۔۔۔ آپ کو حضرت عبداللہ بن جعفر (چچا زاد بھائی) سے بڑا پیار تھا۔ جب آپ

مکہ سے کوفہ جانے والے راستے پر چل پڑے تو عبداللہ، حاکم مدینہ سے امان کا خط لکھوا کر، مدینہ سے دوڑے، راستے میں آپ کو آروکا اور مدینہ جانے کے لیے اصرار کیا، لیکن آپ کو رضا مند نہ کر سکے۔ تاہم اپنی وفا کی نشانی کے طور پر، اپنے دو بیٹے آپ کے ساتھ شریک سفر کر دیے، جو کربلا میں شہید ہو گئے۔۔۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور سیدہ زینب رضی اللہ عنہا میں جو محبت تھی، وہ محتاج بیان نہیں۔ آپ اپنی ازواج اور اولاد سے بھی گہری محبت و شفقت رکھتے تھے۔ اپنی ایک بیٹی سیدہ سکینہ (فداہا امی) اور ان کی والدہ حضرت رباب سے آپ کو خاص الفت تھی۔ آپ کا ایک شعر ہے:

لَعَمْرِي أَنِّي لِأَحَبُّ أَرْضًا
تَحِلُّ بِهَا السَّكِينَةُ وَالرَّبَابُ

”مجھے جان کی قسم! میں اس سرزمین سے محبت رکھتا ہوں، جہاں

سکینہ اور رباب بستی ہیں“۔۔۔

آپ اپنے بچوں سے محبت بھی کرتے تھے مگر ان کی تربیت کا بھی پورا خیال رکھتے تھے۔ پیچھے علم و فضل کے باب میں معلوم ہو چکا ہے کہ آپ اپنے بیٹوں علی اور زید اور بیٹیوں سکینہ اور فاطمہ کو حدیثیں یاد کراتے تھے۔۔۔

صفات عالیہ

آپ کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ میں وہ صفات عالیہ جمع فرمادی تھیں، جو عظیم انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ پیچھے آپ کے جو دو سخا کا ذکر ہوا،

اس کے بعد آپ کی جرأت اور استقلال کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ دراصل یہ دونوں وصف آپ میں فطری تھے، حضور سرور عالم ﷺ کے ایک فرمان کا ثمرہ تھے۔۔۔

تہذیب التہذیب میں ہے کہ حضور ﷺ کی آخری بیماری کے دنوں میں، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے دونوں بیٹے ساتھ لیے، حاضر خدمت ہوئیں اور عرض کی:

فَقَالَتْ لَهُ هَذَانِ ابْنَاكَ فَوَسَّوْهُمَا شَيْئًا قَالَ أَمَا حَسَنٌ فَإِنَّ لَهُ
هِيبَتِي وَ سُوْدُوْدِي وَأَمَا حُسَيْنٌ فَإِنَّ لَهُ جُرْأَتِي وَ جُوْدِي ---

[تہذیب التہذیب، جلد ۲، صفحہ ۳۲۵]

” (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا) بولیں، یہ آپ کے بیٹے ہیں، انہیں کچھ

وراثت عطا فرمائیے۔۔۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

”حسن رضی اللہ عنہ کو میری ہیبت اور سرداری ملی ہے اور حسین رضی اللہ عنہ کو

میری جرأت اور سخاوت ملی ہے۔۔۔“

آپ کی جرأت کا یہ عالم تھا کہ بچپن کے زمانے میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت کو بھرے مجمع [۱] میں کہہ دیا۔۔۔

”میرے نانا کے منبر سے اترے۔۔۔“

اسی جرأت اور استقلال طبع کا نتیجہ تھا کہ تاریخ کے بہت بڑے المیہ، سانحہ کربلا میں آپ کا عظیم کردار، روشنی کے مینار کی طرح درخشاں نظر آتا ہے۔ دنیا کا ہر انسان اس واقعہ کی تفصیلات سن کر کانپ اٹھتا ہے مگر کمال ہمت و استقلال ہے آپ کا کہ

[۱]..... یہ بات محض بچپن کے بھولے پن کی وجہ سے تھی۔ بعد میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ

نے پوچھا تھا، آپ کو یہ بات کس نے سکھائی تھی؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

”کسی نے نہیں، میں نے از خود کہی تھی۔۔۔“

گھرانے کے سب چھوٹے بڑے شہزادے، خون میں لیٹے ہوئے ہیں لیکن آپ کے ماتھے پہ شکن نہیں پڑتی، منہ سے اف نہیں نکلتی اور اپنے موقف سے بال برابر پیچھے نہیں ہٹتے اور ان دل دوز حالات میں، دشمن کی ہر بات کا بے باکی سے جواب دیتے ہیں۔ ان کے سامنے تقریریں کرتے ہیں اور شمشیر بدست، صفوں میں گھس جاتے ہیں۔ جرأت اور بے خوفی کا یہ وصف آپ کے ہر ساتھی میں بھی پیدا ہو گیا تھا۔ واقعات کربلا میں حضرت مسلم، قیس بن مسہر اور عبداللہ بن یقظر رضی اللہ عنہم کے حالات دیکھیے، ان لوگوں نے زیاد جیسے جابر اور خوں خوار کے سامنے اس طرح کلمہ حق کہا کہ تاریخ کبھی نہ بھولے گی۔۔۔

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ فنون جنگ میں بھی اعلیٰ بصیرت کے مالک تھے۔ کربلا کا میدان بالکل چٹیل تھا، کوئی آڑ نہ تھی اور کوئی مورچہ نہ بنایا جاسکتا تھا۔ تاہم آپ نے اپنی جنگی بصیرت سے کئی تدبیریں نکال لیں۔ آپ نے اپنی فوج کے عقب پر تمام خیمے اکٹھے کر کے ایک دیواری بنا دی تھی تاکہ دشمن پچھلی طرف سے حملہ نہ کر سکے اور خیموں کے ارد گرد خندق کھود کر اس میں آگ بھردی، یہ خیموں کی حفاظت کی تدبیر تھی۔ جنگ شرع ہوئی تو پہلے آپ نے کافی دیر تک انفرادی جھڑپوں کا سلسلہ جاری رکھا، جس میں دشمن کا کافی نقصان ہوا، پھر جب کوفیوں کی گھوڑ سوار فوج ایک دم آگے بڑھی تو آپ نے اپنے جوانوں کو حکم دیا کہ زمین پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاؤ اور نیزے دشمن کے رخ پرتانے رکھو، اس طرح سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے، نیزوں کی انیوں سے زخمی ہو گئے اور مجبوراً اس رسالے کو پسپا ہونا پڑا۔۔۔

اسلام کے دلیر، نڈر، مستقل مزاج اور دانا سپاہی ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہم خدا کے مطیع و مخلص اور اس سے بہت زیادہ ڈرنے والے بندے تھے۔

راتوں کی تنہائی میں اللہ کی یاد کرتے، نماز میں روتے اور تلاوت میں بھی آنکھیں تر رہتیں۔
نماز، قرآن اور حج سے آپ کو محبت تھی۔ آپ نے اپنی زندگی میں پچیس حج کیے تھے۔
آپ خدا کی مخلوق، خصوصاً ضعیفوں اور کمزوروں کے ساتھ شفقت اور مہربانی کا سلوک کرتے،
ماتحتوں کی خطائیں معاف کر دیتے۔۔۔

ایک دن آپ کے ہاں چند معززین کی دعوت تھی، ایک غلام نے ایک قیمتی کٹورا
لا پرواہی سے توڑ دیا۔ آپ نے اس کی طرف دیکھا، تو اس نے یہ آیت پڑھی:

وَ الْكَاطِمِينَ الْغَيْظَ۔۔۔

”غصے کو پی جانے والے“۔۔۔ آپ نے فرمایا:

كَظُمْتُ غَيْظِي۔۔۔

”میں نے اپنا غصہ پی لیا“۔۔۔ اس نے اگلا ٹکڑا پڑھا:

وَ الْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ۔۔۔

”اور لوگوں کو معاف کرنے والے“۔۔۔ آپ نے فرمایا:

عَفَوْتُ عَنْكَ۔۔۔

”میں نے تجھے معاف کیا“۔۔۔ غلام نے آگے پڑھا:

وَ اللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۔۔۔

”اور اللہ احسان کرنے والے کو پسند کرتا ہے“۔۔۔ آپ نے فرمایا:

”جا! تجھے اللہ کے لیے آزاد کیا“۔۔۔

حاجت مندوں اور تنگ دستوں کو دیکھ کر آپ کا دل تڑپ جاتا تھا۔ فرزوق شاعر کو

مروان نے شہر بدر کرنے کا حکم دیا، وہ نہایت بے سروسامانی میں آپ کے ہاں پہنچا،

آپ نے چار ہزار اشرفیاں دے کر رخصت کیا۔۔۔

ایک دن آپ کو خبر ملی کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ [۱] بیمار پڑے ہیں، آپ بیمار پرسی کے لیے گئے اور دیکھا کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سخت مضطرب ہیں۔ آپ نے وجہ پوچھی، وہ کہنے لگے، مجھ پر ساٹھ ہزار درہم ہے اور موت قریب آ پہنچی ہے۔ آپ نے فرمایا: ”مطمئن رہیے، میں ابھی بندوبست کرتا ہوں“۔۔۔

یہ کہہ کر اٹھے اور اسی وقت قرض خواہوں کے پاس جا کر ساٹھ ہزار کی رقم اپنے پاس سے ادا کر دی۔۔۔

ایک دفعہ آپ کو بیت المال سے ایک بڑی رقم ملی، آپ وہ رقم لے کر مسجد میں بیٹھ گئے اور کسی ضرورت مند شخص کا انتظار کرنے لگے۔ ایک آدمی بولا:

آپ کا لباس پھٹا ہوا ہے، آپ یہ رقم اس پر صرف کیجیے۔۔۔ آپ نے فرمایا: ”اپنی آرائش پر خرچ کرنے سے زیادہ بہتر یہی ہے کہ یہ رقم کسی محتاج کی

حاجت میں صرف ہو جائے“۔۔۔

آپ فرمایا کرتے تھے:

”اس بات کو خدا کا انعام سمجھا کرو کہ لوگ تمہارے پاس اپنی حاجات

لے کر آئیں، لہذا حاجت مندوں کی حاجت پوری کیا کرو“۔۔۔

ایک دن ایک غریب دیہاتی نے آپ کے دروازے پر اونٹنی کھڑی کی اور یہ شعر لکھ کر

اندر بھیجے:

لَمْ يَبِقْ لِي شَيْءٌ يُبَاعُ بِحَبَّةٍ
فَكَفَاكَ مظهرِ حَالَتِي عَنْ مُخْبِرِي

[۱]..... حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب صحابی، حضرت زید رضی اللہ عنہ کے

صاحبزادے تھے۔ اسامہ رضی اللہ عنہ، حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے بچپن کے ساتھی تھے۔

انہیں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں بیٹھنے کا شرف حاصل تھا۔۔۔

أَبَقَيْتُ مَاءَ الْوَجْهِ كُنْتُ ضَنْنَتَهَا
مِنْ أَنْ يُبَاعَ فَقَدْ وَجَدْتُ الْمُشْتَرِيَّ

”میرے پاس کوئی ایسی چیز بھی نہ رہی، جس سے ایک دانہ خریدا جاسکے۔

میری حالت آپ پر ظاہر ہے، بتانے کی حاجت نہیں۔ میں نے اپنی

آبرو بچا رکھی تھی، اسے کسی کے ہاتھ فروخت کرنا پسند نہ کرتا مگر اب

خریدار مل گیا ہے۔“

اتفاق سے جواب آنے میں ذرا زیادہ دیر لگ گئی اور اعرابی نے چار مصرعے اور

لکھ بھیجے:

مَاذَا أَقُولُ إِذَا رَجَعْتُ وَقِيلَ لِي

مَاذَا أَصَبْتُ مِنَ الْجَوَادِ الْمَفْضِلِ

إِنْ قُلْتُ أَعْطَانِي كَذِبْتُ وَإِنْ أَقُلُّ

بَخِلُ الْجَوَادِ بِمَالِهِ لَمْ يُقْبَلِ

”جب میں لوٹوں گا اور مجھ سے پوچھیں گے کہ صاحب فضل سخی سے

تجھے کیا ملا؟ تو کیا جواب دوں گا۔ اگر کہوں کہ مجھے دیا ہے، تو جھوٹ ہوگا اور

اگر کہوں کہ سخی نے اپنا مال روک لیا ہے، تو یہ بات مانی نہ جائے گی۔“

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے دس ہزار درہم کی تھیلی بھیجی اور یہ اشعار بھی ارقام فرمائے:

عَاجَلْتَنَا فَاتَّكَ أَقْلِلُ بَرَّنَا

كَلَّا وَإِنْ أَمْهَلْتَنَا لَمْ تُقْلِلْ

خُذْهَا وَكُنْ أَنْتَ كَمَا لَمْ تَسْأَلْ

وَنَكُونُ نَحْنُ كَمَا لَمْ نَفْعَلْ

”تم نے جلدی مچادی، سو تمہیں یہ قلیل صلہ مل گیا ہے اور اگر تم جلدی نہ کرتے تو تمہیں بہت زیادہ ملتا۔ اب یہ لے لو اور یوں سمجھنا کہ تم نے سوال ہی نہیں کیا اور ہم سمجھیں گے کہ گویا ہم نے کچھ دیا ہی نہیں“۔۔۔۔۔

وہ پر دیسی رقم لے کر دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔۔۔۔۔

اپنے محبوب نانا رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ بھی غرباء، فقراء اور مساکین سے دلی محبت رکھتے تھے، ضعیفوں اور تنگ دستوں کی مدد فرماتے تھے۔ ایک فارسی مصنف کے الفاظ ہیں:

اہل اخبار اتفاق دارند کہ وے رضی اللہ عنہ در مہمان نوازی و غریب پروری و اعانت مظلوم و ایصال رحم و انعام فقراء و مساکین مشہور آفاق بود برہنہ تنان و حاجت منداں را از نقد و پارچہ امداد فرمودے۔۔۔۔۔

”سیرت نگار بالاتفاق کہتے ہیں کہ آپ مہمان نوازی، غریب پروری، مظلوموں کی مدد، صلہ رحمی اور فقراء و مساکین پر نعمتیں تقسیم کرنے میں مشہور عالم تھے، بے سروسامان اور حاجت مندوں کی، کپڑے اور نقدی سے مدد فرمایا کرتے تھے“۔۔۔۔۔

بیواؤں اور یتیموں کی خبر گیری کرتے تھے، ان کے کام اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”ابا جان یتیموں اور بیوہ عورتوں کے لیے کھانا اور ان کی ضروریات خود اٹھا کر ان کے گھروں تک پہنچاتے تھے، حتیٰ کہ آپ کی پشت مبارک پر نشان پڑ جایا کرتے تھے“۔۔۔۔۔

ان چند سطور کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ اسلامی اخلاق کا پیکر کامل اور اپنے وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا صحیح عملی نمونہ تھے، میں دعا کرتا ہوں کہ خدائے کریم مجھے اور سب مسلمانوں کو اس سیرت طاہرہ سے مستفید ہونے کی توفیق بخشے، آمین۔۔۔

تاریخ کربلا

● مدینۃ النبی سے فرات کے کنارے تک

● ریگ کربلا سے تحت دمشق تک

نقشِ الا اللہ بر صحرا نوشت
سَطْرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت

[علامہ اقبال]

مدینۃ النبی (ﷺ) سے فرات کے کنارے تک

مطالبہ بیعت

۶۰ھ میں یزید نے تخت شام پر قدم رکھتے ہی عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے معاملے کی طرف توجہ کی اور اپنے حاکم مدینہ ولید کو لکھا کہ ابن زبیر اور حسین رضی اللہ عنہما سے جلد بیعت لے لو۔ بیعت کا مطالبہ ہوتے ہی ابن زبیر رضی اللہ عنہ مکہ منتقل ہو گئے اور حضرت امام رضی اللہ عنہ نے ولید [۱] کو کہا کہ یہ معاملات خفیہ نہیں ہوتے۔۔۔

[۱]..... ولید نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا، آپ اپنی فراست سے سمجھ گئے کہ بیعت کا معاملہ ہوگا۔ چنانچہ چند آدھی ساتھ لیے، ان کو دروازے پر بٹھایا، خود اندر گئے۔ ولید نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر سنائی اور یزید کی بیعت کا مطالبہ کیا۔ آپ نے پہلے انا لله وانا اليه راجعون پڑھا۔ امیر معاویہ کے لیے رحمت کی دعا مانگی۔۔۔ پھر فرمایا:

”مجھ جیسا شخص خفیہ بیعت نہیں کر سکتا“۔۔۔ [الحسین]

بھائی کا مشورہ

حکومت اس معاملہ میں سختی کرنا چاہتی تھی اور امام حسین ؑ کے لیے دور ابتلا آچکا تھا۔ آپ صورت حال پر غور کر رہے تھے کہ آپ کے بھائی حضرت محمد بن حنفیہ [۱] نے مشورہ دیا کہ:

”زمانہ پر آشوب ہے، کہیں بھی امن نہیں، البتہ آپ مکہ مکرمہ تشریف لے جائیں، اگر وہاں بھی چین نہ لینے دیا جائے تو آپ ریگستانوں اور پہاڑوں میں نکل جائیں اور جب تک ملک کا کوئی فیصلہ نہ ہو جائے، ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہیں۔ اتنے میں واقعات کی تاریکی ہٹ جائے گی اور آپ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کر سکیں گے کیوں کہ جب واقعات در آتے ہیں تو آپ کی رائے بہت زیادہ صائب ہوتی ہے“۔۔۔

[کامل ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۸، طبری]

روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر دعائے مانگی

بھائی کا مخلصانہ مشورہ سن کر جناب امام حسین ؑ نے سفر مکہ کا ارادہ کر لیا۔ رات کو

[۱]..... حضرت محمد بن حنفیہ ؑ، حضرت علی ؑ کے فرزند تھے، مگر ان کی والدہ، حضرت فاطمہ ؑ تھیں۔ حضرت علی مرتضیٰ ؑ ان سے محبت کرتے تھے۔ وفات کے وقت حسین کو اور ان کو آپس میں احترام و محبت کی وصیت فرمائی تھی (راقم الحروف کا خاندان حضرت محمد بن حنفیہ کی اولاد سے ہے)۔۔۔

نانا جان ﷺ کے روضہ اطہر پر حاضر ہو کر عرض گزار ہوئے:
 ”دعا کیجیے کہ میں صراطِ مستقیم پر قائم رہوں، ایسا نہ ہو کہ عزیزوں کی محبت
 اور بچوں کی مامتا میری صداقت میں حائل ہو جائے۔۔۔۔۔
 میرا عزم ہے کہ وقت آنے پر میں اپنے کلیجے کے ٹکڑے خدا کی راہ میں
 قربان کر دوں اور تیوری پر بل نہ لاؤں“۔۔۔۔۔

مدینہ سے کوچ

۲۷ رجب ۶۰ھ، مطابق ۳ مئی ۶۸۰ء کو سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ رات کی خاموشی میں
 مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔۔۔۔۔
 آپ مدینہ کو چھوڑ رہے تھے، جہاں آپ نے جنم لیا، جہاں مسجد نبوی کے سایوں میں
 آپ پروان چڑھے اور جہاں آپ اپنے نانا ﷺ کے کندھوں پر کھیلا کرتے تھے۔۔۔۔۔
 نیرنگی تقدیر ہے کہ ایک وہ وقت تھا جب کہ رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے
 مدینہ کی طرف تشریف لا رہے تھے اور آج ابن رسول رضی اللہ عنہ مدینہ سے کوچ کرتے ہوئے
 مکہ کی طرف جا رہے تھے۔۔۔۔۔

امام حسین رضی اللہ عنہ شعب ابی طالب میں

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ [۱] مکہ پہنچ کر شعب ابی طالب میں مقیم ہوئے۔ یہ

[۱]..... آپ ۳ شعبان، ۹ مئی ۶۸۰ء کو مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔۔۔۔۔

وہی بستی تھی، جہاں سرور کائنات علیہ التسلیم والتحیات اس وقت مقیم رہے، جب قریش نے آپ سے بائیکاٹ کیا تھا۔ حجاز میں رسول خدا ﷺ کا نواسہ زندگی کا آخری سفر کر رہا تھا اور ادھر عراق کے عوام و خواص میں ہلچل مچی ہوئی تھی کہ ہمارا امام تشریف لارہا ہے۔۔۔ [۱] کو فیوں نے جناب کو پے در پے خطوط لکھے، جن کا مضمون یہ تھا:

”اب ہم پر کوئی امام نہیں ہے، آپ آئیے تاکہ آپ کے ذریعے اللہ تعالیٰ ہمیں حق پر جمع کر دے۔ اگرچہ نعمان (گورنر کوفہ) [۲] شاہی محل میں ہے، لیکن اس کے ساتھ نہ تو ہم شریک جمعہ ہوتے ہیں اور نہ شریک عید، اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ تشریف لائیں گے تو ہم اس کو اس طرح

[۱]..... کوفہ میں سلیمان خزاعی کے مکان پر ایک خفیہ میٹنگ ہوئی، جس میں سرداران کوفہ نے کہا، ہم امام حسین رضی اللہ عنہ پر جانیں قربان کر دیں گے اور پھر آپ کو خط لکھا گیا۔۔۔

[۲]..... نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ صحابی تھے، کوفہ میں اموی حکومت کے گورنر تھے، جب امام مسلم رضی اللہ عنہ کوفہ پہنچے تو حضرت نعمان رضی اللہ عنہ نے ان پر کوئی سختی نہ کی۔ یہی وجہ تھی کہ ہزاروں کوئی امام مسلم رضی اللہ عنہ کے حلقہ بیعت میں داخل ہو گئے۔ حکومت کے ایک حامی نے یزید کو لکھا کہ اگر عراق کی ضرورت ہے تو کوئی انتظام کرو۔ چنانچہ یزید نے ابن زیاد کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا، یہ بڑا سخت مزاج اور ظالم تھا۔ اس کے آتے ہی کوفہ کی ساری فضا بدل گئی۔ حضرت نعمان چوں کہ صحابی تھے، دل میں اہل بیت کی قدر و محبت کا جذبہ رکھتے تھے، انہوں نے اپنی معزولی پر خدا کا شکر ادا کیا کہ اللہ نے آزمائش سے بچایا اور دمشق چلے گئے۔ آگے چل کر جب اہل بیت کا قافلہ یزید کے پاس پہنچایا گیا تو اس نے درباریوں سے پوچھا:

”ان سے کیا سلوک کیا جائے؟“۔۔۔

اس وقت حضرت نعمان رضی اللہ عنہ بولے تھے:

”ان سے وہی سلوک کیجیے جو رسول اللہ ﷺ انہیں اس حال میں

دیکھ کر کرتے“۔۔۔

نکال دیں کہ وہ شام ہی میں جا کر دم لے گا۔۔۔

ان شاء اللہ و السلام عليك و رحمة اللہ و برکاته۔۔۔

[ابن خلدون، کامل ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۱۰۰]

کوفہ کے معززین و عمائد نے تقریباً ڈیڑھ سو چٹھیاں لکھیں اور عام پبلک کے

خطوط کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا۔۔۔

اندازے کے لیے یہ کافی ہے کہ یکم محرم کو مقام سراف پر عراقی لشکر کے سامنے

تقریر کرتے ہوئے، امام حسین رضی اللہ عنہ نے خطوط کے دو بھرے ہوئے تھیلے الٹ دیے تھے

اور فرمایا تھا، یہ ہے تمہاری دعوت۔۔۔ [طبری]

یہ تھا کوفیوں کا مطالبہ اور ادھر مکہ کے اکابر ملت یوں کہہ رہے تھے:

عمرو بن عبد الرحمن

”میں نے سنا ہے کہ آپ عراق جا رہے ہیں، مجھ کو خوف ہے کہ

جن لوگوں نے آپ کی مدد کا وعدہ کیا ہے، وہی آپ سے لڑیں گے۔۔۔“

عبداللہ بن عباس

”ابن عم! لوگوں میں یہ خبر گرم ہے کہ تم عراق جا رہے ہو، مجھ کو یقین ہے

کہ یہ سب تم کو دھوکا دے جائیں گے، تم کو جھٹلائیں گے، تمہاری

مخالفت کریں گے، تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے اور جب تمہارے

مقابلے کے لیے بلائے جائیں گے تو تمہارے سب سے بڑے دشمن
ثابت ہوں گے۔۔۔

عبداللہ بن زبیر

”ان کا مشورہ بھی یہی تھا کہ اگر آپ حجاز ہی میں رہ کر حصول خلافت
کی کوشش کریں تو ہم سب بیعت کر کے آپ کی مدد کریں گے اور آپ کے
خیر خواہ رہیں گے۔۔۔“

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی آپ کے کوفہ جانے کے خلاف تھے۔ انہوں نے
حضرت امام رضی اللہ عنہ کو گلے سے لگایا اور نہایت درد مندی سے اپنا مشورہ عرض کیا۔۔۔
سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کی باتیں پوری توجہ کے ساتھ سنیں، تاہم
آپ نے اپنا موقف تبدیل نہ فرمایا (آپ کوفہ جانے کو کیوں ضروری سمجھتے تھے، یہ وضاحت
کتاب کے آخر میں ملاحظہ کیجئے) حضرت امام رضی اللہ عنہ کو کوفیوں کی طرف سے جو آخری خط
وصول ہوا، اس کی عبارت یہ تھی:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اِلٰی الْحُسَیْنِ بْنِ عَلِیٍّ مِنْ شِیْعَةِ اَبِیْهِ عَلِیٍّ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ
سَلَامٌ عَلَیْكَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ النَّاسَ یَنْتَظِرُوْنَكَ وَ لَا رَاٰی لَهُمْ فِیْ
غَیْبِكَ الْعَجَلُ یَا اِبْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ الْعَجَلُ۔۔۔

”یہ خط حسین بن علی کے نام ہے، جو ان کے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے
شیعہ کی طرف سے لکھا جاتا ہے۔ آپ پر سلامتی ہو، صورت یہ ہے کہ لوگ

آپ کا انتظار کر رہے ہیں اور آپ کے سوا کسی اور کے متعلق (حق خلافت کی مطلقاً) کوئی رائے نہیں رکھتے۔ اے رسول اللہ کے بیٹے! اب جلدی کیجئے۔۔۔

حضرت امام رضی اللہ عنہ نے مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کو کوفہ روانہ کر دیا اور کوفیوں کو یہ خط لکھ دیا:

”جو تم نے لکھا، میں سمجھ گیا، سر دست اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو

بھیجتا ہوں، اگر تمہارے رؤسا نے اپنی تحریر کے مطابق عمل کیا، تو میں عنقریب آ جاؤں گا اور بے شک امام وہی ہے جو کتاب اللہ پر عامل ہو،

عدل اور دین ہدیٰ پر قائم ہو۔۔۔ والسلام۔۔۔ [ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۱۰]

بالآخر ۸ رزی الحج ۶۰ھ، بمطابق ۹ ستمبر ۶۸۰ء کو خود خورشید آسمان اہل بیت

کوفہ کی راہوں میں کرنیں بکھیرنے لگا، یعنی خاندان رسالت کا کارواں عراق کی جانب چل نکلا، جب یہ قافلہ بطن رملہ سے آگے بڑھا تو عبداللہ بن مطیع، جو عراق سے آ رہے تھے،

حضرت امام رضی اللہ عنہ کی راہ میں کھڑے ہو گئے اور پوچھنے لگے:

”آپ حرم سے باہر کیوں تشریف لے آئے ہیں؟“۔۔۔

حضرت امام رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”مجھے کوفہ والوں نے اپنے ہاں بلایا ہے۔۔۔“

حضرت عبداللہ نے عرض کی:

”آپ کوفہ کا قصد نہ فرمائیے، وہاں یقیناً آپ شہید کر دیے جائیں گے۔۔۔“

حضرت امام رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”اچھا جو کچھ خدا نے لکھا ہے، اس سے زیادہ تو کچھ نہیں ہو سکتا۔۔۔“

یہ کارواں وادی رملہ سے گزر کر مقام زرود میں ٹھہرا، یہاں زہیر بن قین کا خیمہ

پہلے سے لگا ہوا تھا، وہ حج سے فارغ ہو کر کوفہ جا رہا تھا۔ یہ معلوم کر کے کہ نبی ﷺ کے

گھرانے والے شوق شہادت میں سفر کر رہے ہیں۔ جناب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور سپاہی بن کر ساتھ روانہ ہو لیا، ادھر طاہرین و طیبین کا یہ گروہ صحرائے کوفہ میں بادہ پیا تھا اور ادھر کوفہ میں ضمیر اور ایمان کے کچے لوگ غدر اور خیانت کا آغاز کر چکے تھے۔۔۔ [۱]

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے بھیجے ہوئے قاصد حضرت امام مسلم رضی اللہ عنہ بن عقیل کو

[۱]..... امام مسلم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کی تعداد ہزاروں تک تھی، ایک دن آپ نے اپنی جمعیت کو ساتھ لے کر ابن زیاد کے محل کا محاصرہ کر لیا، ابن زیاد تند مزاج ہونے کے علاوہ بڑا سازشی اور چال باز بھی تھا، اس نے اپنے آدمی اس لشکر میں بھیج دیئے، جنہوں نے قتل و غارت کی دھمکیوں اور بھاری رشوت کے وعدوں سے کوئی سرداروں کے ارادوں کو متزلزل کر دیا اور وہ محاصرہ چھوڑ کر کھسکنے لگے۔ شام کے بعد حضرت امام مسلم رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو تنہا پایا اور ایک عورت طوعہ کے گھر پناہ لی، جہاں سے آپ کو ابن زیاد کے آدمی گرفتار کر کے لے گئے، ابن زیاد نے کہا:

”تم لوگوں میں تفرقہ ڈالنے آئے ہو۔۔۔“

آپ نے فرمایا:

”ہم عدل و انصاف قائم کرنے اور کتاب و سنت کی دعوت دینے آئے ہیں۔۔۔“

ابن زیاد بولا:

”کہاں تم اور کہاں کتاب و سنت، میں تمہیں اس طرح قتل کروں گا کہ زمانہ اسلام میں آج تک کسی کو اس طرح قتل نہ کیا گیا ہو۔۔۔“

حضرت مسلم رضی اللہ عنہ نے نہایت جرأت سے جواب دیا:

”بے شک تم اسلام میں سب سے زیادہ بدعتیں پیدا کرنے والے ہو، خباث اور کمینگی میں تمہارا کوئی مقابل نہیں۔۔۔“

ابن زیاد نے حکم دیا کہ محل کی چھت پر سے ان کی گردن اڑادی جائے۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی،

یہ واقعہ ۹ رزی الحجہ ۶۰ھ، مطابق ۱۰ ستمبر ۶۸۰ء کو پیش آیا۔۔۔

گرفتار کر کے ابن زیاد کے سپرد کر دیا گیا، جہاں آپ بے دردی سے شہید کر دیے گئے۔۔۔

انا لله وانا اليه راجعون

سوانح کربلا میں خون کی یہ پہلی لکیر تھی، جو کوفہ میں مسلم بن عقیل کے خون سے پھینچی گئی۔ حضرت امام علیہ السلام مقام ثعلبہ میں وارد ہوئے تو یہ پہلی دردناک خبر موصول ہوئی، یہاں بعض ساتھیوں نے ایک مرتبہ پھر واپسی کے لیے اصرار کیا لیکن مسلم علیہ السلام مظلوم کے بھائی پکاراٹھے:

”خدا کی قسم! جب تک ہم بھائی کا بدلہ نہ لے لیں گے یا خود بھی

شہید ہو جائیں گے، واپس نہیں لوٹیں گے۔۔۔“

آگے چل کر ایک مقام پر مسافر صحرائے عشق نے اپنے ساتھیوں کو

مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

”دیکھو ہمارے قاصد کو قتل کیا جا چکا ہے، ہمارے شیعوں نے ہمارا ساتھ

چھوڑ دیا ہے اور صورت حال بالکل دگرگوں ہو چکی ہے۔ لہذا میں

اجازت دیتا ہوں، جو جانا چاہتا ہے، بہ خوشی چلا جائے۔۔۔“

اس تقریر پر جو ادھر ادھر سے آ کر مل گئے تھے، الگ ہو گئے اور صرف مخلصین و صابریں

باقی رہ گئے اور سالار کارواں نے آگے بڑھنے کا حکم فرمایا۔ زبالہ سے آگے نکلے تو

وادی ثعلبہ میں ایک شخص ملا، اس نے بڑے الحاح و اصرار کے ساتھ واپسی کا مشورہ پیش کیا،

آپ نے فرمایا:

”خدا کے حکم کے خلاف نہیں کیا جاسکتا۔۔۔“

جب ۱۱ھ کے محرم کا چاند طلوع ہوا تو یہ پاک کاروان، ذی حشم کے پاس مڑ کر

دامن کوہ میں خیمہ زن ہوئے۔۔۔

اسی میدان میں حربین یزید تمیمی ایک لشکر کی کمان کرتا ہوا آن پہنچا۔۔۔ [۱]

پہلی تقریر

نماز ظہر سب نے شہزادہ خاندان نبوت کے پیچھے ادا کی اور یہیں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے سفر کی پہلی تقریر فرمائی:

”لوگو! میں خود نہیں آیا، مجھے تمہارے خطوط اور قاصد لائے ہیں، تم نے کہا تھا ہمارا کوئی امام نہیں، آپ آئیے کہ آپ کے ذریعے خدا ہمیں سیدھے راستے پر لگا دے۔۔۔“

نماز عصر پڑھ کر جب قافلہ کوچ کرنے والا تھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے پھر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

”لوگو! اگر تم خدا سے ڈرو اور حق دار کا حق پہچانو، تو یہ خدا کی رضا مندی کا موجب ہوگا۔۔۔“

حز کو یہ تاکید کی گئی تھی کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو واپس نہ جانے دینا اور نہ کہیں ادھر ادھر ہونے دینا۔ انہیں کوفہ کی حد تک پہنچا کر چھوڑنا، چنانچہ وہ برابر آپ کی نگرانی کرتا رہا۔ جب آپ مقام بیضہ پر پہنچے تو آپ نے ایک مفصل تقریر فرمائی:

[۱].....رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے رضی اللہ عنہ نے حکم دیا:

”ان کو پانی پلاؤ اور ان کے گھوڑوں کو بھی سیراب کر دو، یہ گرمی میں آ رہے ہیں۔۔۔“

اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔۔۔

”لوگو! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، جس نے ظالم، محرّمات الہی کو حلال کرنے والے، خدا کے عہد توڑنے والے، سنت رسول کے مخالف اور خدا کے بندوں پر زیادتی کے ساتھ حکومت کرنے والے بادشاہ کو دیکھا اور اس کو قولاً یا عملاً غیرت نہ آئی تو خدا کو حق ہے کہ اس کو اس بادشاہ کی جگہ دوزخ میں داخل کرے۔۔۔“

لوگو! خبردار ہو جاؤ، انہوں نے شیطان کی اطاعت اختیار کی ہے اور رحمن کی اطاعت چھوڑی ہے، ملک میں فساد پھیلایا ہے، حدود الہی کو معطل کر دیا ہے، خدا کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر رکھا ہے، اس لیے مجھے غیرت آنے کا زیادہ حق ہے۔۔۔“

میں علی اور فاطمہ بنت رسول (رضی اللہ عنہما) کا بیٹا حسین ہوں، میری ذات تم لوگوں کے لیے نمونہ ہے، اگر تم عہد توڑ کر میری بیعت کا حلقہ اپنی گردن سے نکال ڈالو گے تو مجھے اپنی جان کی قسم، یہ بھی تم سے کوئی بعید نہیں۔ جو عہد شکنی کرتا ہے، وہ گویا خود اپنے کو دھوکا دیتا ہے، عنقریب خدا مجھ کو تمہاری امداد سے بے نیاز کر دے گا۔۔۔ [ابن اثیر، جلد ۴]

حر کہنے لگا:

”اگر آپ نے جنگ کی، تو آپ قتل ہو جائیں گے۔۔۔“

آپ نے فرمایا:

”جب اسی نے اپنے چچا زاد بھائی کو رسول خدا ﷺ سے الگ کرنے کے لیے قتل کی دھمکی سنائی تھی تو اس نے جواب میں جو شعر پڑھا تھا، میں بھی تیرے جواب میں وہی پیش [۱] کرتا ہوں:

[۱]..... اس کے ساتھ کے دوسرے اشعار مع ترجمہ پیچھے آچکے ہیں۔۔۔

سَامُضِي وَمَا بِالْمَوْتِ عَارٌ عَلَيَّ الْفَتَى
إِذَا مَا نَوَى خَيْرًا وَجَاهَدَ مُسْلِمًا

”میں یوں ہی بڑھتا چلا جاؤں گا کیوں کہ ایک جوان مرد کے لیے

موت کوئی طعنہ نہیں جب اس کے ارادے نیک ہوں اور وہ سچا مسلمان مجاہد ہو“---

بیضہ سے چل کر عذب الہنجانات پہنچے اور وہاں سے قصر بنی مقاتل میں

تشریف لائے، جو راستے کی آخری منزل تھی اور اب اپنے وقت کا مقدس ترین قافلہ،

جس کی سارے عالم میں نظیر نہ تھی، جس کی ہودج نشین زہراء جنت کی بیٹیاں تھیں،

جس کا سالار کارواں شہ سوار دوش مصطفیٰ (ﷺ) تھا، جس کے عمائے کو آسمان کے ستارے

نگاہوں سے چوم رہے تھے اور جس کے قدموں کو صحراء کے ذرے بو سے دے رہے تھے۔

اپنے سفر کو ختم کر کے ۲ محرم الحرام ۶۱ھ، بمطابق ۲ اکتوبر ۶۸۰ء نینوا کے میدان

کرب و بلا میں اقامت گزیر ہوا، جہاں موت کو ہمیشہ کی شکست اور زندگی کو ہمیشہ کی

فتح نصیب ہونے والی تھی:

اس میں ہزنی ہیں موت کو پیہم ہزیمتیں

کرب و بلا کی خاک ہے میدان زندگی

دس محرم تک

فرات کے کناروں پر رسول اللہ ﷺ کے گھروالے خیمہ زن ہو چکے تھے۔۔۔
 ادھر کوفہ کے گورنر ہاؤس میں ان کے استیصال کے لیے سکیمیں بنائی جا رہی تھیں۔۔۔
 عمرو بن سعد، ری کی حکومت کے لالچ میں تاریخ کے اس سنگین ترین جرم کے لیے
 آمادہ ہو گیا۔۔۔

۲ محرم الحرام کو بنو ہاشم کا غریب الوطن قافلہ پہنچا تھا اور اگلے دن ۳ محرم کو ابن سعد
 کوفی اور شامی افواج کی کمان کرتا ہوا، کربلا میں کربلا پناہ کرنے کے لیے آ گیا۔۔۔

ابن زیاد کا آرڈر

فرات کے کنارے پر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کا جائزہ لے کر نیزان کے خیالات معلوم کر کے ابن سعد نے ابن زیاد کو خط لکھا۔ اس خط کے جواب میں ابن زیاد نے لکھا [۱]:

”نہیں نہیں، کوئی صورت نہیں، مگر یہ ہمارے ہاتھ میں ہاتھ دے دیں“۔۔۔

[تہذیب التہذیب، صفحہ ۳۵۲]

اس کے ساتھ ہی کوفہ کی طرف سے دوسرا حکم یہ موصول ہوا کہ قافلے والوں پر پانی بند کر دو اور بیعت کا مطالبہ جاری رکھو۔۔۔

چنانچہ پانچ سو سواروں کی ایک جماعت فرات کی موجوں کی نگرانی کرنے لگی۔

[۱]..... ابن سعد اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے درمیان کئی گفتگوئیں ہوئیں، خلاصہ یہ تھا کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ کی طرف سے تین چیزیں پیش کی گئیں:

- ① مجھے سرحدوں پہ جانے دو۔۔۔
- ② یزید کے پاس پہنچنے دو کہ براہ راست اس سے گفتگو کروں۔۔۔
- ③ مجھے حجاز واپس جانے دو۔۔۔

ابن سعد نے خوش ہو کر ابن زیاد کو خط لکھا، ابن زیاد بھی پہلے یہ تجاویز منظور کرنے پر آمادہ نظر آیا مگر شمر نے یہ کہہ کر کہ ”حسین پھر قابو نہیں آئیں گے“ اس رائے کو بدل دیا اور اس نے ابن سعد کو لکھا:

”میں نے تمہیں حسین کی طرف سے سفارشیں کرنے کے لیے نہیں بھیجا،
انہیں ہتھیار ڈالنے کا حکم دو، نہیں تو انہیں قتل کر دو“۔۔۔

[ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۲۸]

آپ نے ابن سعد کو پیغام بھیجا کہ میں تم سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں، اس نے منظور کر لیا۔ پندرہ چہ رات کے وقت دونوں بیس بیس سپاہیوں کا دستہ لے کر خیموں کے درمیان ایک دوسرے سے ملے۔ کافی دیر تک بات چیت ہوتی رہی، اس اہم گفتگو کا مضمون کہیں نہیں ملتا، صرف قیاس آرائیاں ہیں۔ بہر کیف اتنا تو ظاہر ہے کہ اس گفتگو کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، کیوں کہ کشیدگی بدستور باقی رہی، فوجی پہرہ اور پانی کی بندش میں کوئی فرق نہ آیا۔۔۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض کہتے ہیں کہ امام حسین رضی اللہ عنہ نے کہہ دیا تھا کہ میں یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے پر رضامند ہوں۔ لیکن حافظ ذہبی اور علامہ ابن حجر اس روایت کو تسلیم نہیں کرتے۔ عقبہ بن سمان کہتے ہیں:

”میں مدینہ سے مکہ اور مکہ سے عراق تک برابر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ

کے ساتھ رہا اور شہادت تک ان سے جدا نہ ہوا مگر آپ نے مدینہ میں،

مکہ میں، عراق میں، لشکر گاہ میں، غرض تادم شہادت کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ

مجھے یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے دو۔۔۔

خیر یہ کوئی ایسی روایت تو ہے نہیں کہ اس کے ازالے میں کچھ مزید کہنے کی

ضرورت ہو، ہمارے نزدیک تو سانحہ کربلا کا سارا فلسفہ ہی یہ ہے کہ:

چڑھ جائے کٹ کے سر ترا نیزے کی نوک پر

لیکن یزیدیوں کی اطاعت نہ کر قبول

ابن زیاد کا آخری آرڈر

ابن زیاد کا جو تیسرا جابرانہ آرڈر آیا، وہ یہ تھا:

”میں نے تمہیں اس لیے نہیں بھیجا کہ تم ڈھیل دیتے رہو، دن بڑھاتے چلے جاؤ اور حسین کے وکیل بن کر ان کی سلامتی چاہو۔ تم حسین اور ان کے ساتھیوں کو میرا حکم ماننے کے لیے کہو، مان جائیں تو ہمارے پاس بھیج دو، نہیں تو فوراً حملہ کر دو۔ یہ سرکش اور جھگڑالو ہیں۔۔۔“

اگر یہ کام تم سے نہ ہو سکے تو فوج شمر ذی الجوشن کے حوالے کر دو، وہ خود

میرے آرڈر کی تعمیل کرے گا۔۔۔ [کامل ابن اشیر، صفحہ ۲۸]

ابن زیاد کے اس آخری حکم نے کش مکش کر بلا کو جنگ میں تبدیل کر دینے کا کام کیا۔ ابن سعد، والی کوفہ کے تیور بھانپ گیا اور وہ ہاشمی مسافروں کے خلاف آخری قدم اٹھانے کے لیے آمادہ ہو گیا۔۔۔ کوئی افواج میں حرکت پیدا ہوئی تو شمر اہل بیت کے خیموں کے پاس جا کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے بھائیوں کو کہنے لگا:

”چوں کہ میں تمہارا ماموں ہوں، لہذا ازراہ قرابت میں تمہیں

امان دیتا ہوں۔۔۔“

انہوں نے جواب دیا:

”تجھ پر اور تیری امان پر ہم پھٹکار بھیجتے ہیں، اگر تجھے حق قرابت ملحوظ ہوتا

تو ہمیں امان دیتا اور ابن رسول کو نہ دیتا؟۔۔۔“

[ابن اشیر، جلد ۴، صفحہ ۴۷]

جنگ کی وارننگ

عصر کے بعد ابن سعد ایک دستے کی ہمراہی میں مدنی خیمہ گاہ کے پاس جنگ کی وارننگ دینے کے لیے آیا، سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ باہر تشریف نہ لائے، صرف یہ کہلا بھیجا کہ آج کی رات گزر جانے دو، صبح دیکھا جائے گا۔ ابن سعد واپس چلا گیا۔۔۔

دسویں رات

یہ ۹ محرم الحرام کا دن تھا، جب رات کی تاریکی چھانے لگی تو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے گھرانے کے تمام افراد اور رفقاء کو جمع فرمایا اور انہیں آخری مرتبہ مشورہ دیا:

”میں تم لوگوں کو خوشی سے اجازت دیتا ہوں، میری طرف سے کوئی ملامت نہ ہوگی۔ رات ہو چکی ہے، ایک ایک اونٹ لے لو، خدا تم سب کو جزائے خیر دے، تم لوگ اپنے اپنے شہروں اور دیہاتوں میں چلے جاؤ، یہاں تک کہ خدا یہ مصیبت آسان کر دے۔۔۔“

یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ (یہ) لوگ مجھی کو ڈھونڈیں گے، میرے بعد کسی کی تلاش نہ ہوگی۔۔۔“

ساتھیوں کے ولولے

عقیل کے بیٹوں نے عرض کی:

”خدا کی قسم! ہم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے، ہم لوگ جان، مال اور اہل و عیال سب کچھ آپ پر قربان کر دیں گے۔ جو انجام آپ کا ہوگا، وہی ہمارا ہوگا۔ آپ کے بعد جینا بے کار ہے۔“

مسلم بن عوسجہ اسدی نے عرض کی:

”خدا کی قسم! اگر میرے پاس کوئی ہتھیار بھی نہ ہوتا تو دشمن سے پتھر مار کر لڑتا، یہاں تک کہ آپ پر فدا ہو جاتا۔“

سعد بن عبداللہ حنفی نے عرض کی:

”اگر مجھ کو یہ یقین ہوتا کہ میں ستر مرتبہ قتل کیا جاؤں گا اور ہر مرتبہ آگ میں جلا کر میری راکھ اڑادی جائے گی تو بھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑتا۔“

زہیر بن قین یوں عرض گزار ہوئے:

”خدا کی قسم! مجھے تمنا ہے، میں قتل ہوتا، پھر زندہ کیا جاتا، پھر قتل ہوتا۔ اس طرح ہزاروں دفعہ زندہ ہو کر قتل کر دیا جاتا لیکن کاش خدا آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو بچا لیتا۔“

[ابن اثیر، جلد ۴]

مختصر یہ کہ سالار کاروان کو یقین ہو گیا کہ ان میں سے کوئی بھی جان بچا کر جانا نہیں چاہتا، سب میری طرح چراغ حق کی ضوء پر نثار ہونے کا بے پناہ ولولہ رکھتے ہیں:

تہا [۱] تمہیں نہیں ہو محبت میں خستہ حال

اس راستے میں اور بھی آشفٹہ سر ملے

امام عالی مقام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تلوار کو صاف کرنا شروع کیا اور منہ سے کوئی موثر شعر [۲] گنگنانے لگے۔ جس پر امام کی غم گسار بہن سیدہ زینب بنت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نہ رہا گیا

[۱]..... یہ شعر عارف تخلص کے کسی شاعر کا ہے، میں نے عارف کی جگہ ”تہا“ کر دیا ہے۔۔۔

[۲]..... وہ اشعار مع ترجمہ پچھلے صفحات میں گزر چکے ہیں۔۔۔

خیمہ میں بہن اور بھائی کا مکالمہ

”کاش آج موت میری زندگی کا خاتمہ کر دیتی، آج میری ماں فاطمہ رضی اللہ عنہا، میرے باپ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور میرے بھائی حسن رضی اللہ عنہ میں سے کوئی بھی موجود نہیں۔ بھیا! ان گزرے ہوؤں کے جانشین اور ہم لوگوں کے سہارا تم ہی ہو۔۔۔“

حضرت امام: بہن! حلم و وقار کا ساتھ نہ چھوڑو۔۔۔

حضرت زینب: بھائی! میں آپ پر قربان، میں آپ کے بدلے میں

اپنی جان دینا چاہتی ہوں۔۔۔

حضرت امام: (پرنم ہو کر) بہن ذرا چین سے رہنے دو۔۔۔

حضرت زینب: (آنکھوں سے آنسو برساتے ہوئے) ”آپ کا مجھ کو

الگ کرنا، میرے دل کے ٹکڑے اڑائے دے رہا ہے۔۔۔“

پھر آپ شدت گریہ سے بے ہوش ہو گئیں۔ غم زدہ بھائی نے بے ہوش بہن کے

چہرے پر نظریں جمادیں، جب انہیں کچھ ہوش آیا تو آپ نے تلقین فرمائی۔۔۔

بہن کو وصیت

”بہن! خدا سے تسکین حاصل کرو، ایک نہ ایک دن تمام روئے زمین

کے باشندے مرجائیں گے، آسمان و زمین میں کوئی بھی باقی نہ رہے گا، ایک خدا کی ذات باقی رہے گی..... ہر مسلمان کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات نمونہ ہے، تم اسی نمونہ سے صبر و تسلی حاصل کرو۔۔۔

بہن! میں تم کو قسم دلاتا ہوں کہ میں شہید ہو جاؤں تو اسوۂ رسول ﷺ کے خلاف نہ کرنا، میری موت پر گریبان نہ پھاڑنا، منہ نہ نوچنا اور بین نہ کرنا۔۔۔

[ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۵]

رات کا ایک حصہ گزر چکا تھا، کربلا کے شہزادے نے سب کو تسکین و تسلی کی تھپکیاں دے کر سلا دیا اور خود زندگی کی اس آخری رات میں اپنے رب ذوالجلال سے یوں باتیں شروع کیں:

”خدا یا! نتیجہ مجھ کو معلوم ہے مگر میرے ساتھی میرے اصرار پر بھی میرا ساتھ

نہیں چھوڑتے۔ میری بہن، بھائی اور بچے سب تجھ پر قربان ہوں۔۔۔

احکم الحاکمین! میری ناچیز قربانی قبول فرما، بچوں کی محبت میرے مقصد ایثار میں

حائل نہ ہو۔ میرے خوصلے بلند فرما، دشمن کے سامنے جری بن کر گلا کٹواؤں،

عزیزوں کے جنازے اٹھاؤں مگر زبان پر صبر و شکر کے سوا کچھ نہ لاؤں۔۔۔

کسے معلوم ہے کہ امام مطہر، سید اطہر، پسر رسول، پارۂ قلب بتول نے

حیات ظاہری کی اس آخری شب میں کس کیفیت کی عبادت کی ہوگی، اپنے اللہ کو

کس طرح یاد کیا ہوگا؟۔۔۔

صرف ایک روایت ملتی ہے، جو ان کی رات کے ماحول کی ایک جھلک دکھاتی ہے۔۔۔

جعفر بن سلیمان کہتا ہے:

”میں محرم کی دسویں رات کو کربلا کے میدان میں آل حیدر کے خیموں کی

بستی میں گیا، درمیانی خیمے سے روشنی کی مدھم شعاعیں آرہی تھیں، میں نے جھانک کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ امام سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے سامنے قرآن کریم کھلا ہوا ہے، آپ سوز سے تلاوت کر رہے ہیں اور آنسو برسنا رہے ہیں“ --- [تہذیب التہذیب]

دل میں ہو یاد تری گوشہ تنہائی ہو
پھر تو خلوت میں عجب انجمن آرائی ہو

آخری صبح

رات گزری اور امام حسین رضی اللہ عنہ کے لیے دنیا کی آخری صبح طلوع ہوئی، میدان میں ایک طرف بہتر (۷۲) مسافر تھے اور دوسری جانب ہزاروں کی تعداد میں مسلح فوجیں تھیں ---

آپ نے خدا کی کتاب سامنے رکھ کر ایک مرتبہ پھر صبر و سکون اور تسکین و ثبات کے لیے اللہ کریم سے دعا مانگی، پھر میدان میں آ کر کوئی عسا کر کی قطاروں کے سامنے زندگی کی آخری تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

”لوگو! میرے نسب پر غور کرو، کیا میں تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی رضی اللہ عنہا کا لڑکا نہیں ہوں، کیا تمہیں فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم یاد نہیں کہ ہم جو انسان جنت کے سردار ہیں؟ ---

جاؤ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے پوچھ لو، ابو سعید خدری، زید بن ارقم اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے پوچھ لو“ ---

قیس بن اشعث بولا:

تم اپنے بنی عم کا کہنا کیوں نہیں مان لیتے؟---

آپ ﷺ نے جواب دیا:

”خدا کی قسم! میں ذلیلوں کی طرح اس کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دوں گا

اور غلاموں کی طرح اس کا اقرار نہیں کروں گا“---

اسی اثنا میں افواجِ کوفیہ متحرک ہو رہی تھیں، ابن سعد آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک

حضرت حر بنی اشعث مدنی قافلے کی طرف آگئے اور مسلمانوں کے آقا ﷺ کی طرف سے

ایک تقریر کی --- [۱]

اس کے جواب میں ابن سعد نے پہلا تیر چلا کر جنگ کر بلا کا آغاز کر دیا ---

تھوڑی دیر تک فرداً فرداً لڑائی ہوتی رہی، حجازیوں کا ایک ایک آدمی مقابلہ کرتا ہوا

شہید ہو رہا تھا مگر دشمن کا کافی نقصان ہوتا جا رہا تھا ---

[۱]..... حر کا دل شروع ہی سے دھڑک رہا تھا، آج وہ دونوں خیمہ گاہوں کے درمیان کھڑے

کچھ سوچ رہے تھے۔ ایک کوفی سپاہی نے کہا:

”حر! تم جیسا بہادر اور یہ حالت کیا سوچ رہے ہو“---

حضرت حر نے کہا:

میں جنت اور دوزخ کے درمیان کھڑا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کدھر جاؤں؟---

پھر فرمایا:

”لو میں نے جنت اختیار کر لی“---

یہ کہا اور سیدنا امام حسین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور عرض کی:

اگر میں آپ پر قربان ہو جاؤں تو کیا پہلی لغزشیں معاف ہو جائیں گی؟---

جناب نے فرمایا:

”ہاں، تم دنیا و آخرت میں حر (آزاد) ہو“---

بالا خرقہ عراقی کمانڈروں نے ایک دم پیش قدمی کا حکم دیا اور غربت کدہ اہل بیت پر

تیروں کا مینہ برسا دیا۔۔۔

علی اکبر رضی اللہ عنہ

جب زہیر بن قیس، مسلم بن عوسجہ اور حضرت حر، نیز دیگر رفقاء اپنے محبوب آقا پر
جانیں فدا کر چکے تو خاندان نبوت کے جوانوں کی باری آئی۔ سب سے پہلے سیدنا علی اکبر رضی اللہ عنہ
تشریف لائے، آپ بہادروں کی طرح خراماں خراماں بڑھے، زبان پر یہ شعر تھا:

أَنَا عَلِيُّ بْنُ حُسَيْنِ بْنِ عَلِيٍّ

وَرَأْبِ الْبَيْتِ نَحْنُ أَوْلَىٰ بِالنَّبِيِّ

”میں حسین بن علی کا بیٹا علی ہوں، بخدا ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے

سب سے زیادہ قریبی ہیں۔۔۔“

اس کم سن شہزادے پر مرہ بن منقذ تمیمی نے نیزے کا وار کیا، آپ گرے اور

فوج نے جسم کے ٹکڑے کر دیے۔۔۔

بیٹا شہید ہو گیا اور صابر باپ نے لاش اٹھا کر اپنے خیمہ کے قریب لا کر رکھ دی اور

دل پر فگار پر مرہم صبر و قرار رکھتے ہوئے پڑھا:

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔۔۔

بعد ازاں عبداللہ بن مسلم، عدی بن جعفر، عبدالرحمن بن عقیل، محمد بن عقیل،

قاسم بن حسن اور ابوبکر بن حسن رضی اللہ عنہم ساغر شہادت نوش فرماتے گئے۔ آخر میں

حضرت عباس رضی اللہ عنہ ظہور فرما ہوئے اور وہ بھی راہِ خدا میں اپنی جان قربان کر گئے۔
اب شہزادہ بیمار سیدنا زین العابدین رضی اللہ عنہ تھے یا شہزادہ سرور کونین سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ تھے۔
ان کے علاوہ بستانِ رسالت کی ساری کلیاں مسلی جا چکی تھیں۔۔۔

کتنا استقلال، کتنا حوصلہ اور کتنا صبر و ثبات تھا، سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ میں۔ بھائی،
بھتیجے اور بیٹے خون کی چادریں اوڑھ کر سو چکے ہیں۔ جن عزیزوں کے دم سے زندگی کی
بہاریں قائم تھیں، اب ان کی لاشوں کے ٹکڑے چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں۔
سب سہارے ٹوٹ چکے ہیں اور ساری امیدیں ختم ہو چکی ہیں، لیکن آپ ہیں کہ
بدستور حلم و وقار کا کوہ گراں ہیں، ماتھے پر شکن نہیں، زبان پر اُف نہیں، آواز میں ضعف نہیں،
عقابی نگاہوں کی تیزی میں فرق نہیں اور پائے ثبات کو ذرا بھی لغزش نہیں ہے۔
خیمے میں آتے ہیں، ہتھیار لگاتے ہیں، سواری پر قدم رکھتے ہیں اور غمیدہ خواتین کو
صبر و رضا کا نمونہ بن جانے کی تلقین کرتے ہوئے، انہیں الوداع کہتے ہوئے اور
آخری سلام قبول کرتے ہوئے خیمے سے باہر تشریف لاتے ہیں۔ پھر جب
فرزندِ مصطفیٰ رضی اللہ عنہ نے میدانِ کارخ کیا تو کربلا کے ڈرے اور لالہ زار جنگ کی فضا میں
تکبیر و مرجبا سے معمور ہو گئیں:

نکلے حسین تیغ بہ کف خیمہ گاہ سے

گو نجی صدائے مرجبا پیکار گاہ سے

آپ نے ان سنگ دل مجرموں کو آخری بار قرابتِ رسول اور اپنی عزت و حشمت

یاد دلائی:

کہنے لگے حسین ہوں، ابنِ رسول ہوں

سردارِ اہلِ خلد ہوں، جنت کا پھول ہوں

بعد ازاں آپ نے اپنی سواری کو عسا کر شام کی طرف موڑ دیا، کتنا عدیم النظیر یہ منظر تھا کہ عراق کے سارے سو رما ایک طرف اور مدینہ کا ایک مجاہد ایک طرف۔ کوفہ کی مسلح افواج ایک طرف اور حجاز کا تنہا پردیسی ایک طرف۔ تازہ دم، خوش و خرم، اچھلتے کودتے ٹیلے ایک طرف اور شکستہ دل، تفتہ جاں، خستہ تن، غم زدہ اور غم خوردہ جوان ایک طرف۔۔۔

لیکن پھر بھی پورے رسول تھے، قاتلِ مرحب و عبدود کے بیٹے تھے، فاتحِ خیبر شکن کے فرزند تھے، رگوں میں اسد اللہ الغالب رضی اللہ عنہ کا خون تھا، رونگٹے رونگٹے میں حمیت و شجاعت کی گرمی بھری تھی، کارزارِ خونچکاں میں آئے تو شیروں کی طرح گونجتے آئے، مجاہدانہ لے میں جنگی ترانہ گاتے ہوئے آئے:

أَنَا ابْنُ عَلِيٍّ الْخَيْرِ مِنْ آلِ هَاشِمٍ
 كَفَانِي بِهَذَا مَفْخَرًا حِينَ أَفْخَرُ
 وَجَدِّي رَسُولُ اللَّهِ أَكْرَمُ مَنْ مَشَى
 وَنَحْنُ سِرَاجُ اللَّهِ فِي النَّاسِ أَنْهَرُ
 وَفَاطِمَةُ أُمِّي سُلَالَةُ أَحْمَدَ
 وَعَمِّي يُدْعَى ذَا الْجَنَاحَيْنِ جَعْفَرُ
 وَفِينَا كِتَابُ اللَّهِ أَنْزَلَ صَادِقًا
 وَفِينَا الْهُدَى وَالْوَحْيُ وَالْخَيْرُ يُذَكَّرُ

”میں اس علی رضی اللہ عنہ کا فرزند ہوں جو بہترین بنو ہاشم تھے، نسبی فخر کے وقت

یہی بات میرے لیے کافی باعث افتخار ہے۔۔۔

میرے نانا رسول خدا ﷺ تھے، جو ساری خلق سے افضل ہیں اور ہم لوگ انسانیت کے لیے اللہ تعالیٰ کا روشن چراغ ہیں۔۔۔

میری والدہ، وہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں، جو رسول اللہ ﷺ کا جگر پارہ تھیں اور میرے چچا حضرت جعفر طیار ذوالجناحین رضی اللہ عنہ ہیں۔۔۔

ہم ہی میں اللہ کی سچی کتاب نازل ہوئی اور ہمارے گھرانے میں ہدایت، وحی اور نیکی کا چرچا رہتا ہے۔۔۔

آپ رضی اللہ عنہ نے حملہ کیا، صفیں درہم برہم ہو گئیں، کوئی آگے آنے کی جرأت نہ کرتا تھا، شدت قتال سے آپ پر تشنگی غالب آنے لگی، پہرے کی قطاروں کو چیرتے ہوئے فرات کے لب پر جا پہنچے، پانی کا بھرا ہوا چلو منہ کے قریب تھا کہ حصین بن نمیر نے دندان مبارک پر کھینچ کر تیر مارا، دہن اظہر سے خون کا فوارہ چھوٹا اور پانی کا چلو، خون کے چلو میں تبدیل ہو گیا، آپ نے آسمان کی طرف اچھال دیا:

یہ حوصلہ اہلِ رضا تو بھی دیکھ لے

او بے نیازِ خون وفا تو بھی دیکھ لے

اب جسم میں تب و تاب ختم ہو رہی تھی، دشمن محاصرہ کیے تھا، اسی دوران میں آپ رضی اللہ عنہ کی گود میں ایک بچہ دیا گیا کہ دنیا سے رخصت ہونے والے باپ کے سایہ عاطفت کی آخری بہار لے لے۔ مگر ظلم کے ایک تیرنے، اس ننھی ہستی کو آغوشِ حسین میں ہی سلا دیا۔۔۔

میدانِ جنگ میں شمر نے فوجیوں کو لاکارا:

”تم سے حسین قتل نہیں ہوتا؟ دیکھتے کیا ہو، بڑھ کر حملہ کرو۔۔۔“

یہ سنتے ہی نزعہ تنگ کر دیا گیا، ایک تیر آپ کی گردن میں پیوست ہو گیا، آپ اسے نکال رہے تھے کہ زرعہ بن شریک نے تلوار کے متواتر وار کیے، جس سے بدن زلزلانے لگا، عین اسی کیفیت میں سنان کے نیزے نے آپ کو بالکل ٹڈھال کر دیا اور زمین پر تشریف لے آئے۔۔۔ پھر اسی سنان [۱] بن انس نخعی نے تاج و رِامامت کا سر مقدس، بدن مطہر سے جدا کر دیا۔۔۔ انا لله و انا اليه راجعون

اس طرح دس محرم الحرام ۶۱ھ، مطابق ۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء کو خاندان نبوت کے خون کی سرخی، عروسِ حق و صداقت کے عذارِ تاباں کا غازہ بن گئی۔ عشق و محبت اور صبر و رضا کی داستانِ عنوانِ کربلا پر تکمیل پا گئی اور ایمان و ایقان کی بلندیوں پر امام حسین رضی اللہ عنہ کے نام کا پرچم ہمیشہ کے لیے لہرا دیا گیا:

تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز

زندہ از تکبیر او ایماں ہنوز

در نوائے زندگی سوز از حسین

اہل حق حریت آموز از حسین

کوفیوں کی آخری ذلیلانہ حرکت یہ تھی کہ خیموں میں گھس گئے، سامان لوٹ لیا، آگ لگادی اور لاشوں پر گھوڑے دوڑا کر، وحشت و ویرانی کا پورا سماں باندھ دیا، اس طرح ۲ محرم الحرام کو ریگ کربلا پر اترنے والا فاطمی کارواں، آج دس محرم الحرام کو اپنے کوئی میزبانوں کے ہاتھوں بالکل اجاڑا جا چکا تھا۔ سلیمان بن قتیبہ عدوی کہتا ہے:

مَرَّاتٌ عَلٰی اَبْنِيَّاتِ آلِ مُحَمَّدٍ

فَلَمْ اَرَهَا اَمْ شَالَهَا يَوْمَ حَلَّتْ

[۱]..... بعض نے لکھا ہے کہ سر مبارک شمر نے الگ کیا تھا۔۔۔

وَكَانُوا غِيَاثًا ثُمَّ اضْحَوْا رَأْيِيَّةً
الْأَعْظَمَتْ تِلْكَ الرَّأْيَا وَجَلَّتْ

[الحماسه]

”میں اولاد رسول ﷺ کے خیموں کے پاس سے گزرا تو مجھے وہ رونق
نظر نہ آئی، جو ان کے تشریف لانے کے دن تھی۔۔۔۔
یہ تو لوگوں کے حامی و ناصر تھے اور اب خود مظلوم بن کر رہ گئے،
ہائے یہ کتنے عظیم مصائب ہیں۔۔۔۔“

ریگ کر بلا سے تخت و مشق تک

خاندان نبوی کے ان صابر کاروانیوں کو راہ ایثار و رضا کی ابھی کچھ اور منزلیں طے کرنا تھیں کہ ”ابھی عشق کے امتحان اور بھی تھے“ کوفہ سے آرڈر آیا کہ جو کاروانی تلوار سے بچ گئے ہیں، انہیں یہاں گورنمنٹ ہاؤس میں حاضر کیا جائے۔۔۔

چناں چہ ابن سعد کے سپاہی، فاطمی خواتین، بچیوں اور عابد بیمار کو ساتھ لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے، بیبیوں نے راستے میں اپنے شہداء کی لاشیں، زمین پہ یوں ہی کھلی دیکھیں، آنسو نکلے، دل دکھا، قافلے والے تو یہاں رک کر ہدیہ دل پیش کرنا چاہتے تھے:

تھم ذرا بے تابی دل ٹھہر جانے دے مجھے
 اور اس بستی پہ چار آنسو بہانے دے مجھے
 لیکن مجبوری تھی۔ کارواں یوں ہی گزرتا چلا گیا، حتیٰ کہ یہ لوگ قصر دارالامارت
 میں لا کر والی عراق ابن زیاد کی کرسی کے سامنے کھڑے کر دیے گئے۔۔۔

لب مبارک پر چھڑی ماری گئی

سرور کونین رضی اللہ عنہ کے نواسے کا سر طشت میں رکھا ہوا تھا، جب مخمور نشہ حکومت،
 ابن زیاد نے سید الشہداء رضی اللہ عنہ کے دندان مبارک پر چھڑی ماری تو ایک بوڑھے صحابی
 حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ برداشت نہ کر سکے آپ نے فرمایا:

”مجھے اللہ کی قسم، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لبوں کو چومتے ہوئے
 دیکھا ہے۔۔۔“ (حضرت زید رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے)
 ابن زیاد نے کہا:

”خدا تجھے ہمیشہ رلائے، اگر تو بڈھا پھوس نہ ہوتا تو میں تیری گردن

اڑا دیتا۔۔۔“

جب ابن زیاد کی نگاہ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ پر پڑی، تو اس نے ان کے
 قتل کا حکم بھی دے دیا، لیکن حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی شدید دل بستگی نے اس کا ارادہ
 بدل کر چھوڑا۔ ابن زیاد نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے کہا تھا:

”دیکھا! خدا نے تمہارے اہل بیت کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟“۔۔۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے جواب دیا:

”بے شک ان کی شہادت مقدر ہو چکی تھی، سو وہ مقتل میں تشریف لائے،

لیکن عنقریب کل داؤر محشر کے حضور وہ تم سے انصاف طلب کریں گے“۔۔۔

کوفہ کے بعد دمشق کا راستہ اختیار کیا گیا، کاروان حسب دستور سفر طے کر رہا تھا

کہ ایک شخص زحر بن قیس نامی بڑی تیز رفتاری کے ساتھ دمشق میں جا پہنچا، جب اس نے

کربلا کے دردناک حوادث فخریہ انداز میں پیش کیے تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی

کہ یزید نے اسے کوئی صلہ نہ دیا، بلکہ کہا:

”ابن زیاد پر خدا کی لعنت ہو، اگر میں ہوتا تو حسین کو معاف کر دیتا“۔۔۔

(کیا یزید کا نظریہ واقعی یہی تھا یا اس کی یہ بات وقتی پالیسی کے ماتحت تھی؟

اس میں مورخین مختلف ہیں)

تاریخیں لکھتی ہیں کہ یزید نے پس ماندگان اہل بیت کے ساتھ نرمی اور محبت کا

برتاؤ کیا، حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کو لگا تار اپنے ساتھ شاہی دسترخوان پر

کھانا کھلاتا رہا، یزید نے چند روز کے بعد ان حضرات کو اپنی راجدہانی سے رخصت کر دیا،

فوج کا ایک دستہ ساتھ روانہ کیا، جو ان لٹے ہوئے اور ستائے ہوئے کاروانیوں کو

مدینہ طیبہ تک پہنچا آیا، یہ وہی مدینہ الرسول تھا، جہاں سے اس سفر عشق کی ابتدا ہوئی تھی

اور آج جب کہ محبت و عشق کی بازی جیتی جا چکی تھی، اس مہم کی انتہا بھی اسی

مدینہ الرسول پہ ہو رہی تھی:

مرد مومن را محمد ﷺ ابتدا ست

مرد مومن را محمد ﷺ انتہا است

جب یہ قافلہ مدینہ کی گلیوں سے گزرا ہوگا تو گلیوں کے ذڑوں نے اور فضا کی موجوں نے پوچھا ہوگا، قافلے والو! ابن رسول کہاں ہیں، جنت کے پھول کہاں ہیں اور پارہ قلب بتول کہاں ہیں؟---

جب یزید کا ملازم، اہل بیت کے قافلے کو مدینہ چھوڑ کر واپس جانے لگا تو حضرت زینب اور دوسری بیبیوں نے اپنے باقی ماندہ زیوراتا کر اسے دینے چاہے، اور فرمایا: یہ تمہارے اس احسان کا صلہ ہے کہ تم نے ہمیں بہ حفاظت یہاں پہنچا دیا۔---

مگر قاصد نے لینے سے انکار کر دیا۔---

کر بلا کا انتقام

نہ یزید کا وہ ستم رہا نہ زیاد کی وہ جفا رہی
جو رہا تو نام حسین کا جسے زندہ رکھتی ہے کربلا

جو لوگ کربلا میں حجازی مسافروں پر ظلم و ستم ڈھاتے رہے، تاریخ بتلاتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی قدرت کی گرفت سے نہ بچ سکا، ہر ایک مجرم نہایت قلیل عرصے میں بدترین قسم کی ذلت و خواری میں مبتلا ہو کر اپنے کیفر کردار کو پہنچا، جو نشہ حکومت میں مخمور ہو کر اپنے قبراقتدار کو ناقابل تسخیر سمجھتے تھے، ان پہ خدا کی لاٹھی یوں برسی کہ ان کی لاشوں پر ایک آنسو نہ بہایا گیا:

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ ---

یزید

صرف ساڑھے تین سال کی حکومت کے بعد یزید کو موت کے پتے نے آدبوچا،

موت کے وقت وہ اپنے شکار کے قلعہ میں مقیم تھا، اس کا زمانہ دینی خدمات اور اسلامی فتوحات سے خالی رہا، بلکہ وہ اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے بہت برانام حاصل کر کے بہ ہزار حسرت و حرماں دنیا سے رخصت ہوا۔ یزید کے بعد اس کے بیٹے نے تخت حکومت پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا:

”تم مجھے خلیفہ منتخب کرتے ہو، مگر میں اس کا اہل نہیں اور آج اس امت میں

کوئی عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی نظر نہیں آتا، جس کے سپرد یہ کام کیا جاسکے۔۔۔

یہ کہہ کر وہ گوشہ نشین ہو گیا اور تین ماہ کے بعد راہی ملک عدم ہوا۔ اس کے بعد مروان بن حکم کو صاحب تخت بنا دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سانحہ کربلا کے بعد تین سال میں یزید اور اس کی اولاد سلطنت سے محروم ہو کر رہ گئی۔۔۔

مختار ثقفی

مختار کا باپ عبیدہ ثقفی، عہد فاروقی میں کوفہ و عراق کا والی تھا۔ جو یوم الحمرہ کی مشہور عجمی جنگ میں پیل سفید کے پاؤں تلے کچلا گیا تھا، ۶۰ھ میں جب مسلم بن عقیل کوفہ میں تشریف لائے تو وہ پہلے مختار ہی کے گھر ٹھہرے تھے، بعد میں ہانی بن عروہ کے ہاں تشریف لے گئے تھے۔ اسی جرم کی پاداش میں ابن زیاد نے مختار کو جیل بھیج دیا تھا، سانحہ شہادت کے بعد مختار کو رہا کر دیا گیا، مختار سمجھتا تھا کہ اب اس کے عروج کا زمانہ قریب ہے۔ وہ سیدھا مکہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا، چوں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ خود بہت بڑے مدبر، دانا اور ماہر سیاست تھے۔ اس لیے مختار کو یہاں اپنی حیثیت صرف ضمنی اور جزوی نظر آئی، بالآخر وہ حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ

(حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے جو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن اطہر سے نہیں تھے) سے ایک اہم سرنوشت لکھوا کر کوفہ چلا آیا۔۔۔

انتقام کر بلا کا ولولہ مسلمانوں میں ایک آتشیں سرنگ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا کہ جب کوئی چاہتا، اسے آگ دکھا کر کوہ آتش فشاں بنا سکتا تھا۔ عراق میں ”تو ابین“ کی تحریک صرف انہی مقاصد کے لیے معرض وجود میں آئی تھی، اب اس ماحول میں مختار جیسے عیار (جو کئی دفعہ جیلوں سے پراسرار طریقوں سے فرار ہو چکا تھا اور اپنی نت نئی چالاکیوں سے پبلک کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتا تھا) کی کامیابی میں کیا رکاوٹ ہو سکتی تھی؟۔۔۔

چنانچہ اس نے انتقام کر بلا کے نعروں کے ساتھ اپنی بیعت کا سلسلہ جاری کر دیا، انہی ایام میں ایک دوسرے شخص سلیمان بن حرورہ کے ارد گرد چھبیس ہزار کا ایک انبوه جمع ہو گیا، مختار سے پہلے یہ لوگ شام کی طرف کوچ کر گئے، راستے میں عین الورد کے مقام پر شامی فوج کے ساتھ ان کی خون ریز جنگ ہوئی۔ اگرچہ اس جنگ میں عسا کر شام کے بہت سے کمانڈر میدان میں کھیت رہے لیکن آخر عراقی پسپا ہو کر کوفہ چلے آئے، سلیمان میدان میں کام آ گیا، جب شکست خوردہ فوج کوفہ واپس آئی تو مختار گورنر کوفہ کی قید میں تھا، لوگوں نے کہا کہ ہم تجھے جیل سے رہا کراتے ہیں، وہ کہنے لگا:

تم خاموش رہو، میں خود بخود رہا ہو جاؤں گا۔۔۔ اور واقعی کچھ دن

گزرے تھے کہ وہ رہا کر دیا گیا۔۔۔

اب مختار کی بیعت و امارت کے دروازے کھل رہے تھے، ادھر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے سابقہ گورنر کی جگہ عبداللہ بن مطیع کو عراق کا گورنر بنا دیا، اسی تبدیلی کے دوران میں مختار کے ہاتھ پاؤں مضبوط ہو گئے تھے، یہاں تک کہ اس نے نئے گورنر کے خلاف قتال شروع کر دیا اور اسے کوفہ سے نکال باہر کیا اور خود کوفہ کی

Handwritten Urdu text, likely a historical document or manuscript. The text is arranged in approximately 18 horizontal lines, written in a cursive style. The content is mostly illegible due to the high contrast and image quality. Some faint words like "میں", "تو", "اور" are visible.

حنفیہ کی خدمت میں روانہ کر دیے۔۔۔

خولی بن یزید کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کاٹے گئے، پھر سولی پر لٹکا دیا گیا اور لاش جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی گئی۔۔۔

سنان اور شمر کو قتل کر کے ان کی لاشوں پر گھوڑے دوڑائے گئے اور ان تمام قاتلوں کے سر، سیدی محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کے پاس مدینہ بھجوائے گئے۔ مختار نے اپنے پولیس کپتان عبداللہ بن کامل کو ایک فہرست بنانے کا حکم دیا، جس میں ان تمام فوجیوں کے نام درج کرنے کی ہدایت کی گئی، جنہوں نے جنگ کربلا میں حصہ لیا تھا۔ نیز یہ حکم دیا کہ ہر ایک کے جرم کی تفصیل لکھو کہ کس نے نیزہ مارا، کس نے تیر چلایا، کس نے تلوار کا وار کیا، کس نے لباس اتارا، کس نے شہید کیا، کس نے سر انور کاٹا اور کس نے گھوڑا دوڑایا؟۔۔۔

پھر یہ اہتمام کیا گیا کہ ہر مجرم کو اس کے کیے ہوئے جرم کی مناسبت سے اس ہی شکل میں ہلاک کیا جاتا تھا۔۔۔

مختار نے اپنی اس تحریک میں ہزار ہا عراقیوں کا خون گرایا اور یقین کامل سے کہا جاتا ہے کہ اس نے کسی مجرم کو بچنے کا موقع نہ دیا۔ سب از حد ذلت و رسوائی، بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں موت کے غار میں دھکیل دیے گئے۔ یہ تھا کوفہ کے ظالموں کا انجام:

رائیگاں جاتا تھا خون شہیدان وفا

رنگ لائے گی ہماری جاں سپاری ایک دن

جب مختار کوفہ کی شورشوں اور مجرموں کے قتل سے فارغ ہوا تو اشتر نخعی فوج لے کر

دوبارہ موصل کی طرف چل نکلا۔ ادھر ابن زیاد نے موصل سے پانچ فرسخ دور

دریائے خازر پر خیمے ڈال دیے۔ اشتر بھی اپنی فوج سمیت مارچ کرتا ہوا، شامی افواج کے سامنے جا پہنچا۔ رات کی تاریکی میں ابن زیاد کے ایک فوجی افسر نے اشتر نخعی سے مل کر کہا کہ میں کل ٹھیک بھڑکتی ہوئی جنگ کے دوران میں اپنے دستے سمیت تم سے آ کر مل جاؤں گا۔۔۔

صبح کو خاور تباہاں طلوع ہوا، دریائے خازر کے کنارے پر عراقیوں اور شامیوں کی خون ریز لڑائی شروع ہو گئی۔ جب لڑائی اپنی شدت اور جوانی پر تھی تو عراقیوں کا ایک دستہ پیچھے ہٹنے لگا، ایک عراقی کمانڈر نے چیخ کر کہا:

”کوفہ والو! کہاں بھاگتے ہو، کوفہ تو پہنچ نہیں سکتے۔۔۔“

یہ فقرہ سن کر ان کے قدم جم گئے۔ ادھر رات والا شامی کمانڈر اپنے قبیلے کے جوانوں کو ساتھ لے کر اشتر نخعی کی قطاروں میں آ ملا، اب میدان کا نقشہ بدل چکا تھا۔ شامی سپاہیوں کے قدم اکھڑنے لگے، کوفیوں نے بڑھ کر انہیں تلوار کی باڑ پر رکھ لیا، جو کوفیوں سے بچ کر پیچھے ہٹتے، دریا میں غرق ہو جاتے۔ خون اور خاک کے اس تاریک بادل میں ابن زیاد کہیں نظر نہیں آتا تھا، لیکن اشتر نخعی نے چلا کر کہا:

”ابن زیاد کا سر قلم کر کے لاؤ۔۔۔“

سپاہی تلاش کے لیے دوڑے، شام ہو رہی تھی، سورج غروب ہو رہا تھا، جب کہ ابن زیاد پر ایک عراقی سپاہی کی نظر پڑی، چناں چہ عراقی نے اس کی زندگی کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب کر دیا اور سر کاٹ کر اپنے امیر کی خدمت میں پیش کر دیا۔۔۔

یہ عظیم الشان فتح حاصل کر کے اشتر کوفہ آیا، مختار نے دربار لگایا اور اپنی مشہور و معروف طلائی کرسی پر براجمان ہوا، جب کوفہ کے گورنمنٹ ہاؤس میں مختار کے سامنے ابن زیاد کا سر ایک طشتری میں پیش کیا گیا تو عبرت و رقت کا ایک عجیب سماں بندھ گیا تھا۔ کیوں کہ

آج محرم الحرام کی وہی دس تاریخ تھی، کوفہ کا وہی قصر الامارت تھا، جہاں آج سے چھ برس پہلے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لال کا سر انور ابن زیاد کے سامنے لایا گیا تھا۔۔۔

اور آج ابن زیاد کا سر بعینہ اسی طرح، اسی تاریخ اور اسی قصر حکومت میں فرماں روائے وقت کی خدمت میں پیش کیا جا رہا تھا۔۔۔ [۱]

فرق صرف اتنا تھا کہ وہ ۶۱ھ کی دس محرم الحرام تھی اور یہ ۶۷ھ کی دس محرم تھی۔۔۔

اللہ غنی!

تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ --- [آل عمران: ۱۴۰]

لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ --- [الحشر: ۲۱]

نہ یزید کا وہ ستم رہا نہ زیاد کی وہ جفا رہی
جو رہا تو نام حسین کا جسے زندہ رکھتی ہے کربلا

[۱]..... خدا کی شان ہے، عبد الملک نے آگے چل کر اس محل کو مسمار کر دیا، گویا اللہ تعالیٰ نے

اس عمارت کو بھی مٹا دیا جس میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے سر انور کی توہین کی گئی تھی۔۔۔

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا موقف کیا تھا؟

(شبہات اور ان کے جوابات)

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

[مولانا محمد علی جوہر]

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا موقف کیا تھا؟

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے سفر عراق اور اسی سلسلے کے دیگر اقدامات کا مقصد کیا تھا؟ ---
 اس سوال کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں، کسی نے کہا یہ سفر محض جنگ اقتدار کا سفر تھا، کسی نے خیال کیا کہ یہ آپ کی اجتہادی غلطی کا نتیجہ تھا، بعض نے سمجھا کہ آپ حصول خلافت کے لیے کوشاں تھے، بعض کی رائے ہوئی کہ آپ محض کوفیوں کے بلانے پر چلے گئے اور کسی کا نظریہ ہے کہ آپ کلمہ حق بلند کرنا چاہتے تھے۔ غرض یہ کہ کوئی آپ کے طرز عمل کو برحق سمجھتا ہے اور کوئی یزید کی حکومت کے اقدامات کو درست قرار دیتا ہے ---

اس مسئلے میں جو اختلاف نظر آ رہا ہے، وہ زیادہ تر ایک دوسرے سوال کے جواب سے پیدا ہوتا ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ حکومت وقت کے خلاف خروج (بغاوت کے لیے نکلنا) کب جائز، کب ناجائز اور کب ضروری ہوتا ہے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ حکومت اسلامی ہے یا غیر اسلامی، اگر غیر اسلامی ہے تو مسلم حکومت [۱] ہے یا غیر مسلم۔ اور مسلم ہے تو عادل حکومت ہے یا غیر عادل، اسی طرح خروج کے متعلق یہ اندازہ لگانا ضروری ہوتا ہے کہ آیا انقلاب کی کامیابی کے امکانات موجود ہیں یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان مختلف صورتوں میں سوال کا جواب یقیناً مختلف ہو جائے گا۔ پھر یزید کی حکومت کس قسم کی تھی اور اس وقت خروج کی فضا سازگار تھی یا نہ تھی؟ اس کے متعلق بھی مختلف اذہان میں الگ الگ رائیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے سوچنے والے عقیدت، عصبیت یا تعصب سے ہٹ کر نہیں سوچتے۔ لہذا صحیح اور واقعی جواب سامنے آنا، ایک دشوار امر بن کر رہ جاتا ہے۔ مذکورہ تفصیل سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ پر غور کرنے کے لیے دو چیزوں پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ یزید کی حکومت کی نوعیت کیا تھی اور دوسری یہ کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا موقف کیا تھا؟ ---

یزید کی حکومت

یزید کی حکومت سے بحث کرتے ہوئے مذکورہ تفصیل کے علاوہ پہلا سوال یہ ہوگا کہ آیا یہ حکومت شرعی حیثیت سے تسلیم شدہ تھی یا نہیں؟ اس مسئلہ پر اس عہد میں

[۱]..... جب ریاست میں اسلامی قانون نافذ ہو تو حکومت اسلامی ہے اور اگر ایسا نہ ہو لیکن حکمران مسلمان ہو تو یہ مسلم حکومت کہلاتی ہے۔ ---

دونوں رائیں موجود تھیں:

① کچھ لوگ اس طرح سوچتے تھے کہ چونکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی

دست برداری کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ متفقہ طور پر خلیفہ [۱] تھے،

لہذا ان کا مقرر کردہ جانشین یزید بھی مسلم حیثیت کا حکمران تھا اور پھر اکثر

مسلمانوں نے اس کی بیعت بھی کر لی تھی۔۔۔ (۲)

② اس کے برعکس اکثر اہل علم و فضل وہ تھے جو یزید کے تقرر کو تسلیم نہ کرتے تھے

کیوں کہ ان کی رائے میں اس کا تقرر اسلامی اصول کے مطابق نہ تھا،

نیز اس کا فسق و فجور بھی معروف تھا اور اہل مدینہ، اہل مکہ اور اہل عراق کو

اس کی بیعت سے بھی انکار تھا۔ صحابہ کرام اور اکثر اکابر امت درحقیقت

یہی رائے رکھتے تھے، یزید کی حکومت کے بارے میں آخری رعایت

ملفوظ رکھ لی جائے، تو بھی صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اس کی حکومت ایک

تسلیم شدہ [۳] حکومت تھی، تاہم اسے اسلامی حکومت [۴] ہرگز قرار نہیں

[۱]..... خلیفہ کا لفظ، سلطانِ اسلام کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔۔۔

[۲]..... نا صبی فرقہ، اس رائے میں اتنا انتہا پسند واقع ہوا ہے کہ وہ یزید کو امیر المومنین

یزید رضی اللہ عنہ اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کو باغی کہتے ہیں۔ لیکن یہ رائے یا تو اس شخص کی ہو سکتی ہے

جو حقائق اور واقعات سے بے خبر ہو اور یا اس کی، جو بغضِ اہل بیت میں حد درجہ کا

تعصب رکھتا ہو، نعوذ باللہ من ذلك۔۔۔

[۳]..... گو کہ جبر و تشدد اور دھاندلی کے ساتھ اسلامی دنیا کے اکثر حصے پر تسلط

قائم رکھا گیا تھا۔۔۔

[۴]..... جس کے خلاف بغاوت کرنا بہت بڑا گناہ ہوتا ہے اور ایسی بغاوت کو کچل دینا

مسلمانوں کے لیے ضروری ہوتا ہے۔۔۔

دیا جاسکتا، صرف مسلم حکومت کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یزیدی حکومت بہر حال ایک غیر عادل اور غیر صالح حکومت تھی۔۔۔

یزیدی حکومت کی نوعیت معلوم کرنے کے بعد خروج کا مسئلہ بھی معلوم کر لینا چاہیے۔ جب حکومت مذکورہ نوعیت کی ہو (یعنی غیر عادل، غیر صالح بلکہ فحش و فجور کی ترجمان ہو) تو دیکھا جائے گا کہ آیا ایک اچھے انقلاب کے پیدا ہونے کے امکانات ظاہر ہیں یا نہیں۔ اگر انقلاب کی کامیابی کے آثار واضح نظر آتے ہوں تو فقہی نکتہ نظر سے ایسی حکومت کے خلاف خروج کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ امکانات دکھائی نہ دیتے ہوں تو پھر مذکورہ قسم کی حکومت کے بارے میں مختلف اجتہادی آراء پیش کی گئی ہیں:

۱ بعض نے کلمہ حق کہہ دینا ہی کافی سمجھا ہے۔۔۔

۲ بعض نے عملی قدم اٹھانے، یعنی خروج کرنے اور شہید ہو جانے کو ترجیح دی ہے۔۔۔

۳ بعض نے اصلاح اور بہتری کی توقعات پر حکومت کے ساتھ مل کر کام کرنا اور تعاون کرنا مناسب قرار دیا ہے۔۔۔ [۱]

[۱]..... اس سلسلے میں یہ حقیقت بھی مد نظر رہے کہ ہر دور میں حالات مخصوص اور مختلف ہوا کرتے ہیں۔ لہذا کسی ایک دور کی حکومت کے مخصوص حالات پر غور کرنے کے بعد ہی ان مذکورہ آراء میں سے کوئی ایک رائے اختیار کی جاسکتی ہے۔ اس لیے اس معاملے کا فیصلہ بالآخر صاحب حالات کی اپنی دیانت دارانہ سمجھ پر ہی موقوف ہوتا ہے اور یہی سبب ہے کہ بعض اوقات ایک ہی دور میں ایک ہی نوعیت کی حکومت کے متعلق مختلف اصحاب کے نظریات الگ الگ ہو جایا کرتے ہیں۔۔۔

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا موقف

اب یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ۶۰ھ، بمطابق ۶۸۰ء کے سیاسی حالات میں سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا موقف کیا تھا؟ اس چیز کی وضاحت کے لیے تین باتیں معلوم کرنا ضروری ہیں:

- ۱ یزید کی حکومت کے متعلق آپ کی رائے کیا تھی؟---
 - ۲ آپ امت کے لیے کیسی حکومت چاہتے تھے؟---
 - ۳ کیا آپ کے ذہن میں کوئی عملی پروگرام تھا، اگر تھا، تو وہ کیا تھا؟---
- یزید کی حکومت کے متعلق آپ کی رائے وہی تھی، جو اس عہد کے دیگر کاربر ملت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تھی۔۔۔ یعنی یہ اس شخص کی حکومت تھی، جس کی اپنی زندگی بھی غیر اسلامی تھی اور جس کی سلطنت میں بھی اسلامی اقدار پامال کی جا رہی تھیں۔ آپ نے یہ اپنی رائے مختلف مواقع پر ظاہر فرمادی تھی، سفر کوفہ کے دوران مقام بیضہ پر اپنی تقریر میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا:

إِنَّ هَؤُلَاءِ قَدْ لَزِمُوا طَاعَةَ الشَّيْطَانِ وَتَرَكَوْا طَاعَةَ الرَّحْمَنِ
وَأَظْهَرُوا الْفَسَادَ وَعَطَّلُوا الْحُدُودَ وَاسْتَأْثَرُوا بِالْفَنِيِّ---

[طبری، جلد ۷، صفحہ ۳۰۰]

”بے شک ان لوگوں نے شیطان کی پیروی قبول کر رکھی ہے اور رحمن کی اطاعت چھوڑ دی ہے۔ فتنہ و فساد پھیلا رکھا ہے، احکام الہی کو معطل کر دیا ہے اور مال غنیمت میں ناجائز تصرف کرتے ہیں“---

اسی رائے کے پیش نظر مدینہ میں، جب یزید کے عامل نے آپ سے بیعت کا مطالبہ کیا، تو آپ نے انکار کر دیا تھا اور آخر دم تک اسی رائے پر قائم رہے۔۔۔

۲ جب آپ یزید کے طرز حکومت کو پسند نہیں کرتے تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ امت مسلمہ کے لیے کیسی حکومت چاہتے تھے؟ اس سوال کا جواب بھی آپ نے واضح فرما دیا تھا۔ کوئیوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو دعوت کے جو خطوط لکھے، ان میں یہ فقرہ بھی تھا:

إِنَّهُ لَيْسَ عَلَيْنَا إِمَامٌ فَأَقْبِلْ لَعَلَّ اللَّهَ أَنْ يَجْمَعَنَا بِكَ
عَلَى الْحَقِّ --- [کامل اشیر، جلد ۴، صفحہ ۱۰]

”حقیقت یہ ہے کہ ہم پر کوئی امام نہیں، پس آپ تشریف لائیے تاکہ اللہ آپ کے ذریعے ہمیں حق پر جمع کر دے“۔۔۔

چوں کہ اس فقرے میں انقلاب حکومت کی طرف واضح اشارہ تھا، اس لیے اپنے جواب میں امامت اور حکومت کی وہ تشریح کر دی، جو آپ کے ذہن میں متعین تھی:

أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ فَهِمْتُ كُلَّ الَّذِي اقْتَصَصْتُمْ فَلِعُمْرِي مَا
الْإِمَامُ إِلَّا الْعَامِلُ بِالْكِتَابِ وَالْقَائِمُ بِالْقِسْطِ وَالذَّائِنُ بِدِينِ
الْحَقِّ وَالسَّلَامُ --- [ابن اشیر، جلد ۴، صفحہ ۱۰]

”حمد و صلوة کے بعد، میں تمہاری ساری گفتگو کو سمجھ گیا ہوں، لیکن مجھے اپنی جان کی قسم، امام صرف وہی ہو سکتا ہے، جو کتاب اللہ کے مطابق طرز عمل اختیار کرے اور انصاف کو قائم کرے اور دین حق کی اطاعت کرے۔۔۔

فقط والسلام“۔۔۔

یہ وضاحت آپ نے اس لیے ضروری سمجھی تاکہ ان لوگوں پر انقلاب کا صحیح مفہوم

ظاہر ہو جائے، جو انقلاب کی خواہش میں آپ کو مراسلے پہ مراسلہ لکھے جا رہے تھے اور تاکہ وہ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ انقلاب کا مفہوم ایک خاندان کی جگہ دوسرے خاندان کا برسر اقتدار آ جانا ہے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ذہن میں عراقی اور شامی یا اموی اور ہاشمی کا سوال نہ تھا، بلکہ اگر خیال تھا تو کتاب و سنت کے احکام اور حدود الہی کے قیام کا خیال تھا۔ آپ نے اپنے یہ نظریات، اپنے رفقاء پر بھی واضح فرمادیے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب کوفہ میں ابن زیاد نے حضرت مسلم رضی اللہ عنہ سے کہا:

”تم لوگوں میں تفریق پیدا کرنے کے لیے آئے ہو“---

تو آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا تھا:

أَتَيْنَاهُمْ لِنَأْمُرَ بِالْعَدْلِ وَنَدْعُوا إِلَىٰ حُكْمِ

الْكِتَابِ --- [طبری، جلد ۷، صفحہ ۲۶۶]

”ہم ان کے پاس اس لیے آئے ہیں کہ انہیں انصاف کا حکم دیں اور

ان کو قرآن کے قانون کی طرف بلائیں“---

ان باتوں سے طرز حکومت کے بارے میں وہ نظریہ، جو امام حسین رضی اللہ عنہ

اپنے ذہن میں رکھتے تھے، بآسانی معلوم ہو جاتا ہے---

۳ اب تیسرا سوال سامنے آتا ہے کہ آیا، آپ کے ذہن میں اپنے

ان نظریات کو بروئے کار لانے کے لیے کوئی عملی پروگرام بھی تھا اور کیا آپ

اسے اختیار کرنا چاہتے تھے یا کہ نہیں؟---

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ

یزید کی حکومت کے خلاف خروج کرنے کے لیے فقہی حکم کیا تھا، جیسا کہ پیچھے گزرا ہے۔

اس معاملے کی دو سٹیجیں ہوتی ہیں:

..... جب صالح انقلاب کے لیے کامیابی کے آثار نظر نہ آتے ہوں اور اس میں تین طرح کے طرز عمل اختیار کیے جاسکتے ہیں:

- ① جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، یعنی کلمہ حق کہنے پر اکتفا کرنا۔۔۔
- ② بعض عملی قدم اٹھانا، یعنی خروج کرنے اور شہید ہونے کو ترجیح دینا۔۔۔
- ③ اصلاح و بہتری کی توقعات پر حکومت کے ساتھ مل کر کام کرنا اور تعاون کرنا۔۔۔

۲..... جب کامیابی کی توقعات بالکل عیاں ہوں، اس صورت میں خروج ضروری ہوتا ہے۔۔۔

لیکن اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے کہ اس عہد میں پہلی صورت کے حالات پائے جا رہے تھے یا دوسری کے۔ گہرے غور و فکر اور ملکی سیاست کے محتاط مطالعے کی اشد ضرورت تھی اور یہ غور و مطالعہ، دو چیزوں کے بغیر ممکن نہ تھا۔۔۔

پہلی چیز یہ کہ آپ کی زندگی اور آزادی خطرے سے باہر ہو اور دوسری یہ کہ فراغت کا ایک عرصہ مہیا ہو۔ چنانچہ ان ہی دو چیزوں کی تلاش میں آپ نے اپنی محبوب بستی مدینہ الرسول [۱] سے رخصت ہونا اختیار کیا۔ سیدی محمد بن حنفیہ [۲] کا مشورہ بھی اسی چیز پر مبنی تھا۔۔۔

[۱]..... مدینہ میں چوں کہ آپ نے بیعت سے انکار کر دیا تھا، لہذا اب وہاں حفاظت، فراغت اور سکون ذہن کا میسر آنا نہایت دشوار تھا۔ چوں کہ یزید نے اپنے حاکم مدینہ کو جو حکم نامہ بھیجا تھا، اس کا آخری فقرہ یہ تھا، بِالْبَيْعَةِ اخذًا لَيْسَ فِيهِ رُخْصَةٌ۔۔۔ [ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۶]

”بیعت لو اور ایسی گرفت کرو، جس میں کوئی رعایت نہ ہو، تا وقتیکہ بیعت کر لیں“۔۔۔

[۲]..... ان کے مشورے کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ مکہ جائیں اور جب تک ملک کا کوئی واضح فیصلہ نہیں ہوتا، حالات پر غور کریں۔۔۔ [ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۸]

مدینہ سے رخصت ہو کر سفر کوفہ تک سوا چار مہینے کا عرصہ آپ نے مکہ [۱] میں گزارا اور حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے گزارا۔۔۔ اس وقت اسلامی دنیا کے حالات نہایت ہی عجیب و غریب اور متضاد و متعارض واقع ہوئے تھے۔ بہت سی چیزیں ایسی تھیں، جو انقلاب کی کامیابی کی توقع دلاتی تھیں۔ جو مندرجہ ذیل تھیں:

① ملک میں ایک گروہ ان ممتاز اور اہل فضل لوگوں کا موجود تھا، جنہوں نے نہ یزید کے تقرر کو تسلیم کیا اور نہ اس کے حق میں بیعت کی تھی۔ ایسے لوگوں کی تو ایک بڑی اکثریت موجود تھی، جنہوں نے گو بیعت کر لی تھی مگر وہ دل سے حکومت وقت کو قطعاً پسند نہ کرتے تھے۔۔۔

② مکہ، مدینہ، کوفہ اور بصرہ بلکہ پورے حجاز اور عراق، نیز یمن اور طائف کے علاقوں میں سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے حق میں گہری عقیدت اور محبت پائی جاتی تھی۔۔۔

③ اہل عراق کی رائے کو ان حالات میں بہت بڑی سیاسی اہمیت حاصل تھی، کیوں کہ عراقیوں اور شامیوں میں زبردست کشیدگی پیدا ہو چکی تھی۔۔۔ یہ عراقی ہی تھے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں شامی لشکروں کے خلاف نبرد آزما رہے۔۔۔

عراق والوں میں خاندان علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی حمایت ایک مذہبی شعار کی سی حیثیت اختیار کر چکی تھی اور وہ امویوں کی بااذاستی کو کبھی بھی پسند نہ کرتے تھے۔۔۔

[۱]..... مکہ حرم ہونے کی وجہ سے کسی حد تک محفوظ مقام تھا اور نیز فریضہ حج کی وجہ سے

مسلمانوں کا مرکز اور مرجع تھا۔ لہذا یہاں امن کے ساتھ مسلمانوں کے خیالات کا جائزہ لیا جاسکتا تھا، چنانچہ آپ ایام حج تک مکہ میں مقیم رہے۔۔۔

ان حالات میں کم از کم کوفہ میں بہت جلد ایک متوازی ریاست قائم ہو سکتی تھی اور صرف اسی پر معاملہ رک نہ جاتا، بلکہ شجر انقلاب کے مزید پھلنے پھولنے کے آثار بھی موجود ہو جاتے، کیوں کہ اگر کوفیوں اور عراقیوں کو استقلال کی توفیق مل جاتی اور وہ اپنے ارادوں اور وعدوں پر ڈٹ جاتے، تو جلد بصرہ، مکہ، مدینہ، یمن اور طائف کے قبائل بھی بیدار ہو جاتے۔۔۔۔ [۱]

یہ تو وہ حالات تھے، جو انقلاب کے حق میں جاتے ہوئے نظر آ رہے تھے، لیکن معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی موجود تھا، جو اس وقت کے اہل نظر پر پوشیدہ نہ تھا اور وہ یہ تھا کہ اگر کسی قسم کی عملی تحریک شروع ہونے کا وقت آتا تو اس کی ابتداء تین مقامات میں سے کسی ایک جگہ سے ہو سکتی تھی۔۔۔

۱ مدینہ

۲ مکہ

۳ کوفہ۔۔۔

لیکن مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے احترام کے پیش نظر یہاں سے خود حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ انقلابی کام کا آغاز پسند نہ فرما سکتے تھے۔۔۔

اب لے دے کے کوفہ پر نظر اٹھتی تھی۔ اہل کوفہ کو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے یہی خواہ اور حامی چلے آئے تھے، حتیٰ کہ کوفہ کو عہد علوی میں دار الخلافہ بنا لیا گیا تھا۔ تاہم ان کے حالات کچھ قابل اعتبار نظر نہ آتے تھے اور حضرت امام اس بات کو یقیناً ذہن میں رکھتے تھے۔۔۔

[۱]..... سفر کوفہ کے دوران آپ نے بصرہ کے ایک سردار کو خط لکھا تھا۔ اس نے شہر کے معزز لوگوں کو جمع کیا اور ان سے حضرت امام رضی اللہ عنہ کے بارے میں رائے معلوم کی۔ ان سب نے آپ کی حمایت کا وعدہ کیا اور قاصد کو خط دے کر آپ کے پاس جانے کے لیے تیار کیا گیا، مکہ میں اکابر صحابہ نے کہہ دیا تھا کہ آپ یہاں تحریک شروع کریں تو ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں۔ اسی طرح مدینہ، یمن اور طائف میں بھی آپ کے عقیدت مندوں کی کثرت تھی۔۔۔

اگر آپ کو اہل کوفہ پر کامل اعتماد ہوتا، تو ان کے سیکڑوں خطوط کے بعد حضرت مسلم کو حالات کی خبر لینے کے لیے روانہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ فرماتے۔۔۔

حالات کے ان مختلف اور متضاد پہلوؤں میں محض سطحیت اور جلد بازی سے کوئی فیصلہ کرنا نہایت خطرناک ہوتا، کیوں کہ غلط فیصلہ ساری امت کو جنگ کے میدانوں میں کھڑا کر دینے کا موجب بن جاتا اور آپ تو ایک ایک مسلمان کی جان کو از حد عزیز رکھتے تھے۔۔۔ [۱]

لہذا آپ نے حالات پر بار بار غور کیا، ایام حج تک مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیا اور وقت کی سیاست کے ہر گوشے کو بار بار پڑھا اور بالآخر اس طویل اور گہرے غور و فکر کے بعد اور اوپر مذکور ہونے والے انقلابی امکانات کے باوجود بھی آپ کی رائے یہی قرار پائی کہ ہم اس حالت میں نہیں کہ جس میں خروج کرنا لازمی اور ضروری ہوا کرتا ہے۔۔۔

مگر یہاں سوال اٹھے گا کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ سیدنا امام حسین ؑ کے نزدیک مذکورہ حالات میں خروج کے لازم ہونے کی صورت واقع نہ تھی اور یہ کہ آپ نے حکومت وقت کے خلاف خروج ضروری نہیں سمجھا تھا۔۔۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ خروج کے حق میں ہوتے، یعنی خروج کو شرعی لحاظ سے فرض سمجھے ہوئے ہوتے تو رجب کی آخری تاریخوں سے لے کر ذی الحجہ کے پہلے ہفتے تک کی مدت میں اس کے لیے کوئی تیاری ضرور کرتے۔۔۔

کیوں کہ جو چیز شرعی اور دینی لحاظ سے ضروری قرار پائے، اس کے مبادی (تیاری کے ابتدائی مرحلے) اور اسباب و وسائل مہیا کرنا بھی لازم اور ضروری قرار پاتے ہیں اور اس مدت میں عسکری تیاریاں (گو خفیہ سہی) کی جاسکتی تھیں۔ مختلف علاقوں میں

[۱]..... سفر کربلا کے آخری ایام میں جب اپنے آپ کو دشمن کے زرعے میں کھڑا ہوا پارہے تھے اور اس وقت ایک ایک سپاہی کا ساتھ آپ کی حفاظت کے لیے نہایت ضروری تھا مگر پھر بھی آپ اپنے ساتھیوں کو کہتے رہے کہ تم اپنی جانیں بچا کر کسی طرف کو نکل جاؤ۔۔۔

داعی بھیجے جاسکتے تھے اور تحریک کے لیے رضا کار جمع کیے جاسکتے تھے یا کم از کم ملک کے کونوں میں بسنے والے تمام مسلمانوں پر اپنا پروگرام تو واضح کیا جاسکتا تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے ان امور میں سے کوئی امر بھی اختیار نہیں کیا، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے آپ کو خروج کے لازم ہونے والی صورت میں نہیں دیکھ رہے تھے اور نہ خروج کے متعلق آپ کوئی رائے رکھتے تھے۔۔۔ [۱]

آپ کی بصیرت

عدم خروج کے اس فیصلے سے جس طرح آپ کی امن پسندی اور امت کی عافیت خواہی کا پتا چلتا ہے، اسی طرح سیاست اور ملکی معاملات میں آپ کی گہری بصیرت کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل کے سطحی اور عام سیاست دانوں کی طرح کا کوئی شخص ان حالات میں ہوتا تو وہ یقیناً فضا کا ظاہری رخ دیکھ کر غلطی کھاتا اور ملک میں پروپیگنڈہ کی لہریں دوڑا کر، امت کو ایک خطرناک داخلی جنگ میں مبتلا [۲] کر دیتا۔

[۱]..... سفر کوفہ کو خروج سمجھنا ٹھیک نہیں۔۔۔

[۲]..... ذرا فرض کیجیے، اگر حضرت امام عام جنگ کی تیاری کرتے اور ایک دفعہ حکومت وقت کے خلاف اعلان جنگ ہو جاتا تو آپ کی لاکھ کوششوں کے باوجود یہ جنگ اموی اور ہاشمی، عراقی اور شامی کی جنگ بن کر رہ جاتی اور اگلی اور پچھلی کشیدگیوں کے جذبے اس چنگاری کو ایسا کوہ آتش نشاں بنا دیتے کہ جب تک ایک ایک اموی اور ایک ایک ہاشمی زندہ رہتا اس وقت تک یہ جنگ ختم نہ ہوتی، یہاں یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ حضرت امام سفر کوفہ کے وقت پیش کشوں کو کیوں ٹھکرادیتے تھے، جن سے آپ کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہوا نظر آتا۔ ایک شخص نے آخری دنوں میں عرض کی کہ آپ ہمارے پہاڑ پر چلیے، وہاں بیس ہزار کی فوج آپ کی امداد کے لیے تیار ہو جائے گی لیکن آپ نے انکار کر دیا تھا، وجہ یہی تھی کہ طاقت جمع کرنا اور عام جنگ کے حالات پیدا کر دینا مسلمان اور عالم اسلام کے لیے سخت تباہ کن چیز تھی۔۔۔

لیکن آپ نے پیش آمدہ مسائل میں اپنی راہ اس طرح سے متعین فرمائی کہ گویا آپ حالات کے سینے میں اتر گئے تھے اور وقت کی نبض آپ کی انگلیوں میں چل رہی تھی۔ اسی طرح اس فیصلے سے آپ کی شرعی بصیرت اور تفقہ واجتہاد کا مقام بھی معلوم ہوتا ہے۔۔۔ اوپر کی سطور سے معلوم ہوا کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو اس حالت میں نہ سمجھا تھا، جس میں خروج ضروری ہوتا ہے، لہذا مسئلے کی دوسری صورت سامنے آتی ہے، یعنی جس میں حکومت وقت غیر عادل وغیر صالح ہوتی ہے، لیکن اچھے انقلاب کے آثار بھی نمایاں نہیں ہوتے۔ اس صورت میں فقہی حکم تین طریقوں میں بیان کیا گیا ہے [۱]:

۱ کلمہ حق کہنے پر کفایت کرنا۔۔۔

۲ اصلاح کی توقع پر حکومت سے تعاون کرنا۔۔۔

۳ اسباب نہ ہونے کے باوجود خروج کرنا اور شہادت پانا۔۔۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ کے طرز عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ پہلی صورت (خروج کو ضروری سمجھنا) کے حق میں نہ تھے، تو یقیناً آپ کے نزدیک دوسری صورت متحقق ہوگی، لہذا مذکورہ تین راہوں میں آپ نے کون سی راہ اختیار کی، اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے پہلا طرز عمل یعنی باطل کے خلاف کلمہ حق کہہ دینا اختیار فرمایا تھا اور آپ کی طرف سے یہ فریضہ اسی وقت ادا ہو گیا تھا، جب آپ نے مدینہ منورہ میں بیعت سے انکار کیا۔۔۔

کیوں کہ بیعت سے انکار کا مفہوم ہی یہ تھا کہ آپ حکومت وقت کے اطوار کو پسند نہیں کرتے اور احتجاجاً بیعت سے انکار کر رہے ہیں۔ اس کے بعد جہاں کہیں ضرورت پیش آئی، وہاں بھی آپ نے کلمہ حق بلند کیا۔ جیسا کہ مقام بیضہ کا خطبہ پیچھے گزرا،

[۱]..... یہ تفصیل پیچھے گزر چکی ہے مگر سہولت کے لیے یہاں پھر دہرائی گئی ہے۔۔۔

جس میں آپ نے صاف فرمادیا تھا کہ حکومت، کتاب اللہ کے قوانین اور حدودِ الہی کی خلاف ورزی کرتی ہے۔۔۔

اسی طرح آپ وقتاً فوقتاً یزیدی حکومت کے غیر اسلامی اطوار پر تنقید کر کے کلمہ حق کہنے کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ دوسرا طریق کار یعنی حکومت کے ساتھ تعاون کرنا، آپ کے نزدیک درست نہیں تھا، کیوں کہ اصلاح اور بہتری کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ یزید کی سیرت اور اس کے طور طریقے ایسے نہ تھے، جن میں تبدیلی کی کوئی توقع کی جاسکتی تھی۔ لہذا بیعت سے انکار کر کے آپ نے عدم تعاون کا اعلان کر دیا۔ آپ کی اس رائے کی آنے والے وقت نے تصدیق کر دی۔ یعنی جن نیک اور ارباب فضل لوگوں نے اپنی دیانت دارانہ سمجھ کے مطابق، اصلاح کی امید سے حکومت کے ساتھ تعاون [۱] کیا تھا، ان کے طرز عمل کا کچھ نتیجہ نہ نکلا [۲] اور حکومت کی بدعنوانیاں دن بدن بڑھتی چلی گئیں، یہاں تک کہ حرمِ خدا پر سنگ باری کا زمانہ بھی مسلمانوں کو دیکھنا پڑا۔ باقی رہا تیسرا طرز عمل، یعنی اسباب نہ ہونے کے باوجود، خروج کرنا اور شہادت پانا۔ سو اگرچہ یہ فضیلت کی بات تھی، کیوں کہ اگر آپ ایسا کرتے، تو عزیمت پر عمل کرتے، لیکن اس سے بھی زیادہ فضیلت اس بات میں تھی کہ آپ ان نازک حالات میں اپنی زندگی کی حفاظت کرتے، تاکہ کسی بھی آڑے وقت میں امت کی قیادت کی علم برداری کرنے کے لیے موجود ہوتے۔ بے شک خدا کی راہ میں جان دینا بہت بڑا مقام ہے، لیکن ایک قیمتی زندگی کو قوم کی رہنمائی کے لیے محفوظ رکھنا، اس سے بھی بڑا

[۱]..... یعنی امت کو تفریق سے اور حکومت کو جارحانہ کارروائی سے باز رکھنے کے لیے، یزید کے حق میں بیعت کر لی تھی۔۔۔

[۲]..... لیکن اس معاملہ میں بیعت کرنے والے تصور وار تصور نہیں کیے جاسکتے، کیوں کہ ان کی نیت خیر تھی۔۔۔

مقام ہے۔ اسی لیے مسلمان کو اپنی جان کی حفاظت کرنا فرض قرار دیا گیا ہے۔ یہاں پر یہ حقیقت مد نظر رکھنی چاہیے کہ جب شہادت کے اسباب خود [۱] پیدا ہو جائیں، تو اس وقت بندہ مومن پیچھے بھی نہیں ہٹتا، لیکن اگر اپنا اصول برقرار رکھنے کے باوجود جان بچانے کے امکانات ہوں تو بندہ مومن خود بخود موت کی طرف بھی نہیں جاتا اور سیدنا امام حسین ؑ کے حالات ایسے ہی تھے۔ کیوں کہ بیعت سے انکار کر کے اور حکومت وقت کی نااہلی کا اعلان کر کے آپ اپنا فرض منصبی تو ادا کر چکے تھے اور ادا کر رہے تھے اور اگر زندگی ساتھ دیتی تو ادا کرتے رہتے۔ لہذا اب آپ کو بغیر تیاری کے خروج کرنے اور اپنے آپ کو تلوار کے سپرد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ تین باتوں میں سے آپ نے نہ حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کی راہ اختیار کی اور نہ ہی حکومت کے خلاف خروج کرنے کو پسند کیا، بلکہ کلمہ حق کہا اور پوری وضاحت کے ساتھ کہا اور اسی پر کفایت کی۔۔۔

اگر ایک منصف مزاج اور سلیم العقول انسان اس عہد کے حالات پر پوری دیانت کے ساتھ غائرانہ نگاہ ڈالے، تو وہ یقیناً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ ایک ایسا شخص جو ایک طرف وقت کی ظالم و جابر حکومت کی آنکھ میں کھٹک رہا ہو اور دوسری طرف اس کا مقام اور اس کا منصب، اس پر ملت کی رہنمائی کی ذمہ داری ڈال رہا ہو اور وقت کا ہر آنے والا لمحہ اس کے وجود کو اقتدار باطل کے لیے ایک رکاوٹ ظاہر کرتا جا رہا ہو اور ملت کی خدمات کے لیے اس کی زندگی اور سلامتی کو ضروری سے ضروری قرار دے رہا ہو۔ سو اس کے لیے اس موقف سے زیادہ بہتر، زیادہ محتاط اور زیادہ ذمہ دار موقف اور کوئی نہیں ہو سکتا، جو کہ اپنے ان حالات میں سیدنا امام حسین ؑ نے اختیار کیا تھا۔ یہاں پھر ایک دفعہ

[۱]..... جیسے کہ میدانِ کربلا میں پیدا ہو گئے تھے۔۔۔

ہم پر آپ کی خدا داد بصیرت کا بلند مقام واضح ہوتا ہے۔۔۔

سفر کوفہ

آپ کے موقف کی وضاحت میں جو تشریح یہاں پیش کی گئی ہے، اس کے دوران، پڑھنے والے کو ایک چیز کھٹکتی ہے اور وہ ہے سفر کوفہ کا معاملہ۔۔۔

یعنی جب حضرت امام رضی اللہ عنہ کے موقف میں نہ خروج فرض تھا اور نہ قابل ترجیح، تو پھر آپ کوفہ کس مقصد کے لیے تشریف لے گئے۔ کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ خروج کا موقف نہ رکھنے کے باوجود یہی سفر آپ کی شہادت کا باعث بن گیا۔ اس لیے اس مسئلے کی توضیح کی جاتی ہے۔ یہ بات تعجب کی ہے کہ سفر کوفہ کو عموماً سفر خروج سمجھا گیا ہے، حتیٰ کہ بعض معروف مولف [۱] بھی یہ بات لکھ گئے ہیں اور اکثر مورخ بھی یہی کچھ کہتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں اور ایسا نہ ہونے کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:

① جب آپ کی کوفہ کو روانگی کی خبر سنی گئی تو حضرت عبداللہ بن عباس،

[۱]....."الحسین" کے مولف نے لکھا ہے کہ:

"حضرت حسین ایک مقصد اور نظریہ کو سامنے رکھ کر جہاد کے لیے نکلے....."

وحدت اسلامیہ کے اسی جذبے کے تحت آپ نے یزید کے خلاف خروج کیا۔۔۔

حالاں کہ اس رائے کی غلطی بالکل ظاہر ہے کیوں کہ خود مولف نے آپ کی دوران راہ کی وہ گفتگو میں درج کی ہیں، جو خروج کا ارادہ ظاہر نہیں کرتیں۔ مثلاً صفحہ ۱۲۱ پر آپ کا ایک خطبہ دیا ہے:

"اے لوگو! جلدی نہ کرو، پہلے میری بات سن لو..... میرے آنے کی

وجہ بھی سن لو، اگر تم میرا عذر قبول کر لو گے....."

اور پھر آنے کی وجہ کوفیوں کے خطوط کو قرار دیا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ

خروج کا سفر نہ تھا۔۔۔

عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم نے فوراً آپ کے پاس پہنچ کر آپ سے سوال کیا تھا کہ آپ کو فہ کیوں جا رہے ہیں؟ ---

تو ان کے جواب میں آپ نے خروج کا موقف قطعاً بیان نہیں فرمایا۔ علاوہ ازیں راستے میں بھی کئی ممتاز لوگ آپ سے ملتے اور سفر کا مقصود پوچھتے رہے، مگر کہیں بھی آپ نے یہ جواب نہیں دیا کہ میں نے خروج کیا ہے۔ ---

② مقام شراف پر جب حرا ایک ہزار کا لشکر لے کر آ گیا تو آپ نے ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں کوفیوں کے خطوط اور ان کے قاصدوں کی بنا پر آیا ہوں اور اگر اب تم لوگ مجھے ناپسند کرتے ہو، تو میں واپس جاتا ہوں۔ اصل عبارت کے فقرے درج ذیل ہیں:

وان لم تفعلوا او كنتم بمقدمي كاسرهين انصرفتم

عنكم الى المكان الذي اقبلت منه فسكتوا ---

[ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۲۴۲]

”اور اگر تم اپنا عہد پورا نہ کرو یا میرے آنے کو پسند نہ کرو تو میں جس مقام سے

آیا ہوں، وہیں واپس چلا جاؤں گا، پس وہ خاموش رہے“ ---

اگر آپ مکہ سے خروج کے ارادے سے چلے ہوتے تو آپ کوفیوں کے خطوط اور

قاصدوں کو اپنی آمد کا سبب نہ ٹھہراتے، بلکہ پھر تو یہ جواب ہوتا کہ میں اپنے آپ آیا ہوں

اور خروج کے ارادے سے آیا ہوں ---

③ اسی طرح دشمن کے سامنے اپنے شرائط کے طور پر یہ تین باتیں پیش کرنا

اور ان میں اس بات کا بھی شامل ہونا کہ مجھے حجاز واپس جانے دو،

ارادہ خروج کے منافی ہے۔ خروج کا عزم لے کر چلنے کے بعد واپسی پر

غور کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔۔۔

④ سب سے واضح یہ بات ہے کہ آپ کو فہ کے سفر پر خواتین اور بچوں کی معیت میں روانہ ہوئے تھے۔ اگر آپ خروج کا موقف لے کر چلے ہوتے تو بچوں اور عورتوں کو ساتھ لے جانے کا کوئی موقع نہ تھا۔۔۔

بہر کیف ان امور سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کو فہ کا سفر، سفر خروج ہرگز نہ تھا۔ اب یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ آخر اس سفر کا مقصد کیا تھا؟۔۔۔

پیچھے یہ گزرا ہے کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ نے حالات پر غور و فکر کرنے کے بعد حکومت باطلہ کے خلاف حق کا کلمہ کہنے کا مسلک اختیار کیا تھا، لیکن اس دور میں کلمہ حق کہنے والے کی زندگی اور سلامتی خطرے میں پڑ جاتی تھی۔ لہذا آپ کو کسی ایسے محفوظ مقام پر مقیم ہونا چاہیے تھا، جہاں آپ اپنا یہ فریضہ (جسے اس زمانے میں ادا کرنا، صرف آپ ہی کا کام تھا) بلا خطر ادا کرتے رہتے۔۔۔

دوسری بات یہ تھی کہ گوملکی سیاست پر نظر ڈالنے کے بعد آپ نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ انقلاب کی کامیابی کی چنداں توقعات نہیں ہیں۔ چنانچہ آپ نے انقلاب و خروج کے پروگرام کو اپنا موقف نہیں بنایا تھا، تاہم مسلمانوں کے خیالات، جذبات اور جمہور امت کے رجحانات سے باخبر رہنا، آپ کے لیے نہایت ضروری تھا۔ کیوں کہ حکومت بہر حال غیر نمائندہ اور غیر اسلامی نوعیت کی تھی اور اس بات کے امکانات بعید نہ تھے کہ عامۃ المسلمین کسی وقت بھی اس جابرانہ اقتدار کا جوا گلے سے اتار پھینکنے کے لیے تیار ہو جائیں۔۔۔

مختصر یہ کہ اگرچہ وقت کے بصیرت و روانہ مطالعے سے آپ ایک پرامن موقف پر چل رہے تھے مگر دوسری طرف سے یہ اندیشہ ستاتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ امت مسلمہ

مستقبل قریب یا بعید میں با اصول انقلاب کی خواہاں ہو، ان کی نگاہیں متبادل [۱] قیادت کی تلاش میں اٹھیں، لیکن وہ ملک میں صالح قیادت کا سراغ نہ پاتے ہوئے مایوس ہو کر خاموش ہو جائیں۔۔۔

ان ساری باتوں کا حل یہ تھا کہ آپ کو ایک ایسی جگہ پر رہنا چاہیے تھا، جہاں آپ محفوظ بھی رہیں، جہاں آپ کلمہ حق بھی ادا کرتے رہیں اور جہاں آپ مسلمانوں کے انقلابی رجحانات کا جائزہ بھی لیتے رہیں اور یہ ساری باتیں بہ یک وقت کوفہ میں پائی جاتی تھیں۔ کوفہ ہی وہ مقام تھا، جہاں آپ کی حمایت کے دعوے دار سب علاقوں کی نسبت زیادہ تھے، لہذا آپ اپنے کو محفوظ بھی سمجھ سکتے تھے، اقتدار باطل کی بدعنوانیوں پر تنقید بھی کر سکتے تھے اور چوں کہ شامی مرکز کے خلاف مسلمانوں کی طرف سے اٹھنے والی کوئی آواز سب سے پہلے عراق [۲] ہی میں پیدا ہو سکتی تھی، لہذا یہاں آپ ملک کے انقلابی آثار و رجحانات کا مطالعہ آسانی سے کر سکتے تھے۔۔۔

[۱]..... یہ صرف قیاسات نہیں بلکہ اس وقت کے مسلمانوں کے دلی جذبات کی ترجمانی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شامی بازو کے علاوہ امت کا کوئی حصہ بھی یزید اور اس کے عمال کے اطوار کو پسند نہیں کرتا تھا اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے دلوں کی اس دھڑکن کو محسوس کرتے اور اس کے ساتھ ہی اپنی ذمہ داریوں سے بھی باخبر تھے۔ لیکن بایں ہمہ آپ کوئی ایسا قدم بھی نہیں اٹھانا چاہتے تھے کہ جو شریعت اور بصیرت کے خلاف ہو: ع
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

[۲]..... کیوں کہ یہ لوگ عہد علوی سے شامیوں کی نظر میں مغضوب و معتبوب چلے آ رہے تھے اور یہ قاعدہ ہے کہ حکومت کے خلاف زیادہ اضطراب ملک کے مظلوم حصے ہی میں پیدا ہوتا ہے، چنانچہ ایسا ہوا بھی کہ کوفیوں نے حضرت امام رضی اللہ عنہ کو خط لکھتے ہوئے اپنی مظلومی کا اظہار بھی کیا تھا لیکن پھر یہ ان کی بدبختی تھی کہ جب آپ ان کے پاس پہنچے تو وہ اپنے وعدوں سے پھر گئے۔۔۔

کوفہ کی اس پوزیشن کے باوجود حضرت امام علیہ السلام اپنی طرف سے کوفہ کی جانب قدم بڑھانا نہ چاہتے تھے مگر جب کوفیوں کی طرف سے خطوط اور قاصدوں کا تانتا بندھ گیا تو آپ کے لیے سفر کوفہ ضروری ہو گیا۔۔۔

اولاً اس لیے کہ کوفہ ہی میں آپ اپنی منصبی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے، جو آپ امت کی طرف سے اپنے ذمے محسوس فرماتے تھے۔۔۔

ثانیاً اس لیے کہ کوفیوں کی دعوت ظالم کے خلاف مظلوم کی پکار کی حیثیت رکھتی تھی اور انقلابی رجحانات کی طرف اشارہ کرنے والی پہلی چیز تھی، لہذا اسے مسترد کرنے کی کوئی وجہ موجود نہ تھی۔۔۔

اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ سفر کوفہ، خروج کا سفر نہیں تھا، بلکہ وہ مظلومیت کی فریاد کرنے والوں کا جواب تھا اور امت کے جذبات و رجحانات معلوم کرنے کا ذریعہ تھا اور آپ نے اپنے ہر دو مقاصد کو ظاہر بھی فرما دیا تھا۔۔۔

پہلی چیز کو آپ صاف الفاظ میں بیان فرماتے رہے، چنانچہ مکہ مکرمہ کے صحابہ کرام کے جواب میں آپ نے کوفیوں کی دعوت کا ذکر کیا، راستے میں عبداللہ بن مطیع کو بھی بتایا اور دشمن کے سامنے تقریر کرتے ہوئے بھی اس مقصد کا اعلان فرمایا۔۔۔ [۱]

دوسرے مقصد کو بھی آپ نے کہیں کہیں ظاہر فرما دیا تھا، لیکن اسے کسی قدر اشارے میں بیان کیا۔ جب عبداللہ بن جعفر نے راستے میں آ کر اصرار کیا کہ آپ مدینہ چلیں، تو آپ نے فرمایا تھا:

”مجھے نانا جان علیہ السلام نے خواب میں ایک حکم دیا ہے، میں اسے

[۱]..... مقام شراف پر دشمن کے لشکر کے سامنے کوفیوں کے خطوط کے دو تھیلے الٹ دیے گئے تھے۔۔۔

پورا کروں گا، خواہ اس کا نتیجہ میرے موافق نکلے یا مخالف“۔۔۔

[طبری، جلد ۷، صفحہ ۲۸۱]

اس خواب کو شہادت کا اشارہ نہیں سمجھنا چاہیے، کیوں کہ وہ ایک دوسرا خواب ہے جو آپ نے آگے چل کر آخری راتوں میں دیکھا تھا۔ اس خواب کے الفاظ کسی ایسے حکم کا ذکر کر رہے ہیں، جس کے انجام کے دو پہلو ہو سکتے ہیں اور اس کا اشارہ یقیناً مسلمانوں کے حالات سے باخبر رہنے اور اپنی ذمہ داریوں کے احساس کی طرف ہے، کیوں کہ اسی چیز کے دو نتیجے نکل سکتے ہیں۔ اسی طرح مقام عقبہ پر ایک شخص نے بڑی عاجزی سے عرض کی:

”میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں، آپ واپس لوٹ جائیے“۔۔۔

مگر آپ ﷺ نے فرمایا:

”جو تم کہتے ہو میں بھی جانتا ہوں، لیکن خدا کے حکم کے خلاف

نہیں کیا جاسکتا“۔۔۔ [طبری، جلد ۷، صفحہ ۲۹۵]

دراصل اس قسم کے فقرے، اسی دوسرے مقصد کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔۔۔

کربلا میں حضرت شہیر رضی اللہ عنہ کی مظلومیت
 اک حقیقت ہے، اسے تسلیم کرتے ہیں سبھی
 لیکن اس سے بڑھ کے اس میں استقامت آپ کی
 وجہ بطلانِ فجور و ظلم حاکم بن گئی

[راجا رشید محمود]

چند دیگر سوالات

- ① ایک سوال یہ ہے کہ آپ بیوی بچوں کو ساتھ کیوں لے گئے؟ ---
 اس کا جواب یہ ہے کہ جب آپ اپنے لیے کوفہ میں مقیم ہونا ضروری سمجھتے تھے تو اہل و عیال کو پیچھے کیسے چھوڑتے اور اسی سفر میں ساتھ لے جانے کا مقصد دشمن پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہ کاروان، پر امن مقاصد کے ماتحت سفر کر رہا ہے، لہذا ان سے کسی کو کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے ---
- ② ایک دوسرا سوال یہ ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آ کر مشورہ دیا کہ کوفیوں پر اعتماد نہ کیجیے اور بعض مخلصین نے حضور ﷺ کی وہ پیش گوئی بھی

یاد دلائی تھی، جو آپ کی شہادت کے متعلق تھی، تو پھر آپ کو فہ جانا
کیسے ضروری سمجھتے تھے۔۔۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت کی بنیاد ظاہر پر ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو مشورہ دیا تھا،
وہ ایک اندازہ تھا مگر حضرت امام رضی اللہ عنہ کے سامنے کو فیوں کے صدہا خطوط تھے، مگر یہ
سمجھنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ واقعہ اسی سفر میں پیش آ جائے گا۔۔۔ [۱]

شہادتِ مسلم کی خبر ملنے کے بعد؟

③ تیسرا سوال یہ ہے کہ راستے میں آپ کو حضرت امام مسلم رضی اللہ عنہ کی
شہادت کی خبر مل گئی تھی، ظاہر ہے اس کے بعد کو فیوں کا طرز عمل واضح ہو چکا تھا
کہ وہ اپنے وعدوں کو بالائے طاق رکھ چکے تھے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت
امام رضی اللہ عنہ پھر بھی سلسلہ سفر جاری رکھتے ہیں۔ یہ سوال اس بحث کا اہم ترین
سوال ہے، لہذا ہم اس پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔۔۔
واقعہ یوں ہے کہ جب آپ ثعلبہ کے مقام پر پہنچے تو بنو اسد کے ایک شخص نے یہ خبر سنائی۔
آپ نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا، یہاں کچھ رفقاء نے عرض کی کہ اب
واپس چلنا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کے بھائی اصرار کرنے لگے کہ ہم تو
واپس نہیں جائیں گے، یا بھائی کا انتقام لیں گے اور یا پھر خود بھی شہید ہو جائیں گے۔

[۱]..... صدر الافاضل حضرت مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

”یہ یقین کرنے کی بھی کوئی وجہ نہ تھی کہ شہادت کا یہی وقت ہے اور اسی سفر میں

یہ مرحلہ درپیش ہوگا“۔۔۔ [سوانح کر بلا، صفحہ ۵۴]

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اس پر فرمایا:

”تمہارے بعد ہماری زندگی میں کیا خیر ہوگی“ --- [کامل ابن اشیر]

اس کے ساتھ ہی بعض لوگوں نے کہا:

واللہ! آپ سے مسلم کا سا سلوک نہ کیا جائے گا، جو نہی آپ کو ذہ پہنچیں گے،

لوگ جوق در جوق آپ کی فوج میں آ کر شامل ہو جائیں گے --- [۱]

ان باتوں کے علاوہ حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر جس نوعیت سے پہنچی تھی،

وہ خود محل غور تھی۔ کیوں کہ تاریخوں میں اس چیز کے متعلق اختلاف ہے کہ یہ خبر کہاں ملی تھی؟ ---

پھر ایک مورخ لکھتا ہے کہ خبر لانے والے دو اسدی شخص تھے اور دوسرا مورخ لکھتا ہے

کہ صرف ایک آدمی خبر لایا تھا۔ علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہ بات

بہت ہی بعید از گمان سمجھی جاتی تھی کہ خود حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو بھی شہید کر دیا جائے گا۔

آپ کی ایک تقریر کے جواب میں حرنے کہا تھا:

”میں آپ کو خدا کی یاد دلاتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ اگر آپ نے

جنگ کی، تو آپ قتل کر دیے جائیں گے“ ---

اس پر آپ نے خود از راہ تعجب فرمایا تھا:

”تم مجھے موت سے ڈراتے ہو، کیا تمہاری شقاوت اس حد تک

پہنچ جائے گی کہ مجھے قتل کر دو گے“ --- [ابن اشیر، جلد ۴]

اور دراصل حر کا بھی ذاتی خیال یہی تھا کہ آپ کے قتل تک نوبت ہرگز نہ پہنچے گی۔

اس وقت اس نے حکومت کی پالیسی کے مطابق آپ کو دھمکی سنادی تھی، کیوں کہ

دس محرم کو جب یہی حضرت حر رضی اللہ عنہ تائب ہونے کے لیے حاضر خدمت ہوئے تھے، تو

[۱]..... ”الحسین“ نے اس قول کو صفحہ ۹۴ پر نقل کیا ہے ---

خود انہوں نے کہا تھا:

”میں ہی وہ بدنصیب ہوں جس نے آپ کو سب سے پہلے روکا اور یہاں تک لانے کا باعث بھی میں ہی بنا۔ لیکن خدا کی قسم یہ بات میرے گمان میں بھی نہ تھی کہ ان لوگوں کا سلوک آپ سے اس حد تک پہنچ جائے گا“۔۔۔ [طبری، جلد ۷ صفحہ ۳۳۰/ ابن اثیر، جلد ۴]

پھر جن راہوں میں سے آپ سفر کر رہے تھے، ان میں جا بجا ابن زیاد کی پولیس متعین تھی اور جاسوس اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ وہ آپ کے اور اہل کوفہ کے درمیان اس طرح حائل تھے کہ کوئی خبر یا کوئی پیغام ادھر سے ادھر ان کی نظروں سے بچ کر آ جا نہیں سکتا تھا۔ حتیٰ کہ حضرت امام علیہ السلام نے حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کی طرف راستے سے جو دو قاصد روانہ کیے تھے، ان کو ابن زیاد کی اسی پولیس نے گرفتار کر کے ابن زیاد کے پاس کوفہ بھیج دیا تھا، جہاں انہیں بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ اب ظاہر ہے کہ ان حالات میں کسی خبر یا کسی پیغام پر کیا اعتماد کیا جاسکتا تھا اور اس نا کہ بندی کی حالت میں ایک دو آدمیوں کی خبر پر آپ اپنا فیصلہ کس طرح بدل سکتے تھے۔۔۔ [۱]

شہادت تک نوبت کیسے پہنچی؟

④ چوتھا سوال یہ ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے پر امن موقف

[۱]..... کوئی الواقع حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر درست تھی، لیکن آپ تک جن حالات میں اور جن ذرائع سے یہ خبر پہنچی تھی، ان کے پیش نظر تو یہ شبہ بھی کیا جاسکتا تھا کہ شاید ابن زیاد کے آدمیوں نے یہ خبر ویسے ہی مشہور کر دی ہوتا کہ آپ دہشت زدہ ہو کر واپس چلے جائیں اور کوفہ تک پہنچنے کی کوشش نہ کریں۔۔۔

اور اپنے بے ضرر طرز عمل کی، اپنے اقوال و افعال سے وضاحت کر دی تھی۔ آپ نے راستے کی منزلوں پر جگہ جگہ اپنی اپنی تقریروں میں آنے کی وجہ بیان کی تھی۔ پھر عملی طور پر بھی آپ نے امن کا طریق عمل پیش کیا تھا، جب آپ کا قافلہ قصر بنی مقاتل سے آگے نکلا تو حر کو ابن زیاد کا حکم آیا:

”ان کو پانی سے دور چٹیل میدان میں روک دو“---

حرنے آپ کو اس حکم کی تعمیل کے لیے مجبور کرنا چاہا، اس موقع پر آپ کے ایک ساتھی زہیر بن قین رضی اللہ عنہ نے عرض کی:

”اے فرزند رسول (رضی اللہ تعالیٰ عنک)! آئندہ جو وقت آئے گا،

وہ اس سے بھی زیادہ سخت آئے گا، ابھی لڑنا آسان ہے۔ اس دستے کے بعد جو فوجیں آئیں گی، ہم ان کا مقابلہ نہ کر سکیں گے“---

اس پر آپ کا جواب یہ تھا:

”میں اپنی طرف سے لڑائی کی ابتدا نہ کروں گا“---

[کامل ابن اثیر، جلد ۲، صفحہ ۴۳-۴۴]

اسی طرح، طرماح بن عدی نے کہا تھا:

”آپ ہمارے ساتھ چل کر ہمارے پہاڑ کے دامن میں قیام کیجیے،

خدا کی قسم یہ پہاڑ ایسا ہے کہ ہم نے نعمان بن منذر اور غسان و حمیر کے

بادشاہوں کو اس کے ذریعے روکا ہے..... اگر وہاں کوئی خطرہ پیش آیا تو

قبیلہ بنی طے کے بیس ہزار جوان آپ کے سامنے اپنی تلواروں کے جوہر

دکھائیں گے“---

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”خدا تعالیٰ تمہیں اور تمہاری قوم کو جزائے خیر دے، دراصل ہم میں اور ان لوگوں میں عہد ہو چکا ہے، جس کی رو سے ہم لوٹ نہیں سکتے اور ہم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارا اور ان کا معاملہ کیا صورت اختیار کرے گا“۔۔۔

[ابن اثیر، جلد ۴]

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے قول اور فعل سے یہ بات بالکل واضح کر دی تھی کہ آپ کسی جنگی مقصد سے نہیں جا رہے، حتیٰ کہ دشمن آپ کو نرغے میں لیتا جا رہا تھا اور آپ کی واپسی کی تمام راہیں بند کی جا رہی تھیں۔ تاہم آپ مدافعت کے لیے بھی کوئی قدم نہیں اٹھاتے، اس سے بڑھ کر بے ضرر اور باامن روش کیا ہو سکتی تھی؟۔۔۔

لیکن ہم پھر بھی دیکھتے ہیں کہ آپ کے ساتھ حد درجہ نا انصافی کی گئی، معقولیت اور انسانیت کی تمام باتیں بھلا دی گئیں، آھر اس کا باعث کیا تھا اور ان لوگوں کے دماغوں میں کیا بھرا ہوا تھا؟۔۔۔

اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ سب دنیا کی حرص اور اقتدار کے لالچ کے کرشمے تھے۔۔۔ اور مفصل جواب یہ ہے کہ یزید کے حالات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تخت پر قدم رکھتے ہی اپنے اقتدار کو مضبوط بنانے کی ایک سکیم بنائی اور اس کو نافذ کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز قدم اٹھانے کا تہیہ کر لیا، اس نے نظر دوڑا کر دیکھا کہ کون شخص اقتدار کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے، اس سلسلے میں اس کو حضرت امام علیؑ کی ذات سب سے زیادہ کھٹکی، چنانچہ اس نے عامل مدینہ ولید کو لکھا:

اما بعد فخذ حسینا و عبد اللہ بن عمر و ابن الزبیر بالبیعة

اخذا لیس فیہ مراخضة والسلام۔۔۔ [ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۶]

”تم حسین، عبداللہ بن عمر اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے بیعت لو اور ایسی گرفت کرو، جس میں کوئی رعایت نہ ہو“۔۔۔

اس حکم نامے میں سرفہرست حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ہی کا نام ہے۔۔۔ [۱] حاکم مدینہ چوں کہ بیعت لینے میں ناکام رہا اور جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ چلے آئے، تو یزید نے ابن زیاد کو لکھا:

قد بلغنی ان الحسین توجه نحو العراق فضع المرصد و
المسالح و احترس و اجس علی التهمة و خذ علی الظنة غیر
ان لا تقتل الا من قاتلك۔۔۔ [ابن اثیر، صفحہ ۱۸]

”مجھے خبر ملی ہے کہ حسین عراق کی طرف روانہ ہو چکے ہیں، پس تم مورچے اور ہتھیار سنبھالو، جاسوسوں کا سلسلہ قائم کرو اور جس پر شک پڑے، اسے گرفتار کرو۔ مگر یہ کہ قتال اسی سے کرنا جو تم سے قتال کرے“۔۔۔
ان حکم ناموں سے یزید کی روش کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یزید، ابن زیاد سے کچھ ناراض تھا، لیکن جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا معاملہ سامنے آیا، تو اس نے اپنی ناراضگی نظر انداز کرتے ہوئے، اسی ابن زیاد کو بصرہ کے ساتھ کوفہ کا والی بھی مقرر کر دیا، کیوں کہ یزید کے مشیروں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ ابن زیاد کے سوا اور کوئی شخص اس معاملے کو نپٹا نہیں سکے گا۔۔۔

[۱]..... حالاں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وصیت یہ تھی:

”حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے معاملے میں درگزر سے کام لینا، کیوں کہ وہ قرابت دار، بڑے حق دار اور رسول اللہ ﷺ کے عزیز ہیں“۔۔۔

[طبری، جلد ۷، صفحہ ۱۹۷]

یہاں تک وہ کردار ہے، جو یزید نے ادا کیا۔ اس کے بعد پھر جو کچھ ظہور میں آیا، وہ ابن زیاد اور اس کے ماتحت حاکموں کا حصہ تھا۔۔۔

ابن زیاد بڑا تند مزاج، بڑا عیار، بڑا خوف ناک اور خون خوار قسم کا شخص تھا۔ جب وہ بصرہ سے روانہ ہونے لگا تو اچانک اسے خبر ملی کہ بصرہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خط آیا ہوا ہے اور اس کا جواب لے کر ایک قاصد روانہ ہونے والا ہے۔ اس نے اس قاصد کو گرفتار کر کے سولی پر چڑھا دیا اور بصرہ والوں کو گرج کر کہا:

”اگر تم نے حسین رضی اللہ عنہ کی حمایت میں کوئی قدم اٹھایا، تو میں ہر ایسے شخص کو قتل کر دوں گا اور اس کے محلے کے شیخ کو بھی قتل کروں گا“۔۔۔

اس کے بعد وہ کوفہ چلا گیا۔ کوفہ میں ہزاروں آدمی حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کے گرد جمع تھے، لیکن اس نے دھمکیوں اور رشوتوں سے حالات پر قابو پا لیا۔ پھر اس نے حضرت مسلم رضی اللہ عنہ اور ان کے پناہ دینے والوں کو بھی قتل کر دیا۔۔۔

عبداللہ بن یقطر اور قیس بن مسہرہ قاصد تھے، جو حضرت امام رضی اللہ عنہ نے رستے سے حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجے تھے۔ ابن زیاد نے انہیں بھی گرفتار کر کے محل کی چھت پر سے قتل کرا کے پھینکوا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص لوگوں کے قتل اور انسانی جانوں کے ضائع کرنے سے خوش ہوتا تھا۔ یہ تھا اس شخص کا مزاج، جس کے ہاتھ میں سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا معاملہ تھا۔ ابن سعد اس قدر لالچی اور بندہ دنیا تھا کہ ابن زیاد نے اسے بلا کر بلا کی کمان سنبھالنے کے لیے کہا تو پہلے کہنے لگا:

”یا امیر! یہ ابن رسول کا معاملہ ہے، کسی اور کے سپرد کیجیے“۔۔۔

لیکن جب ابن زیاد نے کہا:

”پھر ”ری“ کی حکومت بھی چھوڑنا ہوگی“۔۔۔

تو آمادہ ہو گیا اور یہی وہ شہتی تھا، جس نے میدانِ کربلا میں پہلا تیر چلا کر کہا تھا:

”گواہ رہنا جنگ کا آغاز میں نے کیا ہے“ ---

اور یہ نمائش بھی ابن زیاد کو خوش کرنے کے لیے تھی۔ یہ وہ شخص تھا، جس کے ہاتھ میں

کوئی فوجوں کی کمان تھی ---

تیسرا نام شمر کا ہے۔ اس کی سخت دلی کا یہ عالم تھا کہ جب عمرو بن سعد نے ابن زیاد کو

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تین شرطیں [۱] لکھ کر بھیجیں تو ابن زیاد کہنے لگا:

”ہم ان کو قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں دیکھتے“ ---

لیکن یہ شمر تھا، جس نے کہا:

”اے امیر! حسین رضی اللہ عنہ اس وقت قابو میں ہیں اور چھٹکارا حاصل

کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اب وہ نکل گئے، تو پھر کبھی قابو نہ آئیں گے“ ---

یہ بات ابن زیاد کے ذہن پر بیٹھ گئی اور اس نے عمرو بن سعد کے نام نہایت سخت احکامات

جاری کیے۔ یہ شمر میدانِ کربلا میں فوج کے ایک حصے کا نگران تھا، یہی وہ لوگ تھے

جو کربلا میں بربریت کا ڈرامہ کھیل رہے تھے ---

کوئی بھی اس کھیل میں برابر کے شریک ہو گئے تھے اور ان کا رویہ نہایت تعجب ناک

طریقے سے بدلا۔ چند دن پیش تر وہ حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی حمایت کی

قسمیں کھاتے تھے، اپنے دستخط اور حلف ڈال ڈال کر ان کو خط لکھتے تھے۔ لیکن پھر

انہی لوگوں کی تلواریں، آل علی رضی اللہ عنہ کے خیموں کے آس پاس چمکتی نظر آئیں۔ پہلے وہ

[۱] ۱ سرحدوں پر جانا ---

۲ حجاز واپس جانا ---

۳ یزید کے پاس گفتگو کے لیے پہنچنا ---

ہزار در ہزار جمع ہو کر حضرت امام مسلم رضی اللہ عنہ کے ساتھ ابن زیاد کے محل کا محاصرہ کیے کھڑے تھے اور پھر چند لمحوں کے بعد وہ لوگ امام مسلم رضی اللہ عنہ کو ان کی پناہ گاہ سے پکڑ کر قتل کرنے کے لیے ابن زیاد کے سپرد کر گئے۔۔۔

غدر و خیانت کی کیسی عجیب داستان ہے کہ میدان میں شمشیر بکف کوفیوں کو سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ خطاب کرتے ہیں:

”اے شیت بن ربیع، اے حجار بن الجبر، اے قیس بن اشعث، اے یزید بن حارث! کیا تم نے مجھ کو نہیں لکھا تھا، پھل پک چکے ہیں، کھجوزیں سرسبز ہیں، دریا جوش میں ہیں اور فوجیں تیار ہیں، تم فوراً آؤ۔۔۔ لیکن وہ جواب دیتے ہیں:

”ہم نے نہیں لکھا تھا“۔۔۔

اس پر حضرت نے قسم کھائی اور فرمایا:

”خدا کی قسم! تم نے لکھا تھا“۔۔۔

زہیر بن قین (ایک حسینی سپاہی) نے ان کوفیوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

”خدا نے ہم کو اور تم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت کے بارے میں آزمائش میں مبتلا کیا ہے کہ ہم ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں، میں تم کو ان کی امداد اور ابن زیاد کی رفاقت ترک کرنے کی دعوت دیتا ہوں“۔۔۔

اس پر کوفیوں نے زہیر کو گالیاں دیں اور ابن زیاد کی تعریف کے قصیدے پڑھے۔ اور پھر کہنے لگے:

”خدا کی قسم! ہم حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو قتل یا انہیں

گرفتار کر کے امیر ابن زیاد کے پاس ضرور پہنچائیں گے اور اس کے بغیر

نہیں سکتے۔۔۔

ان باتوں سے کوفیوں کی غدارانہ سرشت کا بہ خوبی علم ہو جاتا ہے اور یہ سب کچھ دھمکی اور لالچ کی کرشمہ سازی تھی۔ ابن زیاد سے لے کر ہر کوفی سپاہی تک، سب کے سب انسانی کردار سے عاری اور شرافت و مروت سے خالی دکھائی دے رہے تھے۔۔۔

ان لوگوں کو اس بات سے غرض نہ تھی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی کس پوزیشن میں تھے۔ کن مقاصد کے ماتحت آئے تھے اور وہ کیا چاہتے تھے۔ البتہ یہ لوگ اتنا جانتے تھے کہ اب حسین رضی اللہ عنہ گرفت میں ہیں، ایسا نہ ہو کہ وہ بچ کر نکل جائیں۔ چنانچہ ان چند کارروائیوں کے لیے عراق کی تمام فوج اور پولیس حرکت میں آ گئی تھی۔ ابن اشیر لکھتا ہے:

”سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے مکہ سے کوچ کی خبریں سن کر ابن زیاد نے قادیسیہ سے خفان اور خفان سے قطقطانہ اور وہاں سے جبل لعلع تک گھوڑا سوار مقرر کر دیے۔۔۔“

ایک دوسرا مورخ بتلاتا ہے کہ قادیسیہ سے عذیب تک سواروں کا جال بچھا دیا گیا تھا تاکہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ بچ کر نہ جاسکیں۔ نیز کوفہ سے حجاز کی طرف جانے والے ہر راستے کی ناکہ بندی کر لی گئی تھی۔ حصین بن نمیر (کوفی پولیس کا بڑا افسر) کو ان تمام انتظامات پر کڑی نگرانی رکھنے کا حکم دیا گیا تھا اور حجاز و کوفہ کے درمیان حکومت کے جاسوس پھیل چکے تھے۔ ان انتظامات کا مقصد یہ تھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کسی علاقے سے ڈاک جاری نہ رہ سکے اور نہ ہی قاصد آ جاسکیں۔ چنانچہ آپ کے دو قاصد پکڑ کر قتل کر دیے گئے تھے۔۔۔

اس ناکہ بندی کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نہ کوفہ پہنچ سکیں اور

نہ واپس جا سکیں اور نہ کہیں ادھر ادھر بچ کر نکل سکیں، چنانچہ حضرت حر رضی اللہ عنہ نے حضرت امام رضی اللہ عنہ کی حمایت میں آنے کے بعد اپنی تقریر میں کہا تھا:

”اے اہل کوفہ! پہلے تم نے حسین رضی اللہ عنہ کو بلایا، جب وہ آگئے تو تم نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ پہلے یہ زعم رکھتے تھے کہ ان کی حمایت میں لڑو گے، پھر ان کے مخالف ہو گئے اور اب ان کے قتل کی فکر میں ہو۔ تم نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا ہے اور خدا کی وسیع زمین میں کسی طرف ان کو جانے نہیں دیتے کہ وہ اور ان کے اہل بیت کسی پر امن مقام پر چلے جائیں اور اس وقت ان کی حالت بالکل قیدی کی سی ہو چکی ہے“ --- [طبری وابن اثیر]

حقیقت یہ ہے کہ یہ محاصرہ اور یہ نا کہ بندی آپ کے مکہ سے روانہ ہونے سے چند دن بعد ہی عمل میں آ چکی تھی کیوں کہ ابن زیاد یہ تہیہ کیے ہوئے تھا کہ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانا ہے اور حسین رضی اللہ عنہ کو بچ کر نہیں جانا ہے ---

لہذا ان حالات میں یہ بات تلاش کرنا عبث ہے کہ آپ کے پر امن طریق کار اور محتاط طرز عمل کے باوجود معاملہ کی نوبت شہادت تک کیسے پہنچ گئی۔ کیوں کہ جب ڈاکوؤں کا ایک گروہ کسی قافلے کو غارت کرنے کا فیصلہ کر لے تو قافلے والوں کی امن پسندی حملہ آور کی خون خواری میں فرق نہیں ڈال سکتی ---

پس اس عدیم النظیر تاریخی معرکے میں دیکھنے کی بات یہ نہیں کہ تلواریں، تلواروں سے کس طرح کھٹکھٹائیں اور تیر و تبر آ پس میں کس طرح ٹکرائے، بلکہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انسانیت اور حیوانیت کی اس کش مکش میں، حیوانوں کے افعال کیا تھے اور انسانوں کا کردار کیا تھا؟ ---

ہم فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کے نواسے، حضرت

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کو عظیم جرأت، بلند ہمت، عالی حوصلہ، حیرت انگیز استقلال اور بے نظیر صبر و ثبات عالیہ کی صفات عطا کی تھیں۔۔۔

۲۷/رجب سے لے کر ۱۰/محرم تک آپ کا ہر قدم، شریعت اور مومنانہ بصیرت کی حدود کے مطابق اٹھتا چلا آیا۔ لیکن جب اتمام حجت کی ہر آخری سے آخری صورت پر عمل کرنے کے باوجود مخالف کی بدبختی میں فرق نہ آیا اور اس وقت بھی جب کسی نے پکار کر بتلایا کہ نجات کی راہ صرف اور صرف یزید کی بیعت ہے۔ مگر آپ کا قال و حال بلکہ روح کی گہرائیاں، جواب دے رہی تھیں کہ اس ذلت کی توقع ہم سے نہ رکھو۔ پھر اس جواب کی جو سزا، وقت کے جھوٹے والی دے سکے، دیتے رہے اور وقت کا سچا شہنشاہ، اسے برداشت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے فرات کے کنارے پر دریا کے پانی کی بجائے، چشمہ شہادت کا پانی پی لیا:

در جہاں نتوان اگر مردانہ زیست

ہم چو مرداں، جان سپردن زندگی است

[ٹیپوشہید]

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے صبر و ثبات اور ان کے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و عظمت پر ابدالاباد تک بے حد و حساب درود و سلام ہوں اور ہمیں ان کی سچی پیروی کی سعادتیں نصیب ہوں۔
آمین یا سرب العلمین۔۔۔

شہ است حسین بادشاہ ست حسین
 دین ست حسین دین پناہ ست حسین
 سر داد نہ داد دست در دست یزید
 حقا کہ بنائے لا الہ ست حسین

[خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ]

شہداء کی یاد منانے کا طریقہ

رمز قرآن از حسین آموختیم
 ز آتش او شعله ها اندوختیم

[علامه اقبال]

شہید کی محبت

شہید حق و صداقت کے نام پر اپنی جان قربان کرتا ہے، اس لیے ملت اس کی قربانی کو محبت و احترام کی نگاہوں سے دیکھتی ہے اور ہر دل میں اس کی محبت کا چراغ فروزاں رہتا ہے۔ سیدنا امام حسین ؓ اور ان کے صابر ساتھیوں کا تذکرہ لبوں پر آتے ہی کون سی آنکھ ہے، جو محبت کے آنسوؤں سے تر نہیں ہوتی اور کون سا دل ہے، جو عشق کی روشنی سے جگمگا نہیں اٹھتا۔۔۔

یادِ منانا

محبت کے مختلف تقاضوں میں سے ایک تقاضا، محبوب کا ذکر کرنا اور اس کی یاد کو

زندہ رکھنا بھی ہے۔ ہر طالب اپنے مطلوب کی باتوں میں لگن رہتا ہے اور ہر چاہنے والا اپنے محبوب کی یاد کو دنیا میں زندہ جاوید بنانا چاہتا ہے۔ دنیا کی تمام قومیں اپنی تاریخ کے بڑے لوگوں کی یاد منانے کے لیے جو مختلف طریقے اختیار کرتی ہیں، ان سب میں یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔۔۔

مسلمان بھی اپنی ملی تاریخ کے عظیم انسانوں کی محبت کو اپنے لیے سرمایہ حیات سمجھتا ہے اور ان کی یادگاروں کو عالم میں زندہ و پائندہ رکھتا ہے، جیسا کہ محبت کا تقاضا ہے۔ لیکن جس طرح زندگی کے دوسرے مسائل میں مسلمان باقی قوموں سے الگ ہے، اسی طرح ان مسئلے میں بھی وہ دوسروں سے بالکل ممتاز نظر آتا ہے کیوں کہ مسلمان اپنے پاس ایک مستقل اور مکمل نظریہ حیات رکھتا ہے، لہذا اس کی زندگی کا ہر گوشہ اسی نظریہ حیات کی کرنوں سے منور ہوتا ہے۔۔۔

چنانچہ مسلمان گوا اپنے اسلاف سے محبت رکھتا ہے لیکن اس کی محبت کا وہ تصور نہیں جو جاہل قوموں میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ اسلاف کی یاد مناتا اور ان کی یادگاروں کو باقی رکھتا ہے، لیکن اس کے طریقے وہ نہیں ہوتے جن کو جہلائے روز گار پسند کیا کرتے ہیں، مثلاً یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے انبیاء کو غلط قسم کی محبت کے جوش میں آ کر خدا کہہ دیا اور کبھی خدا کا بیٹا بنا دیا۔ قرآن حکیم نے اس محبت کو سراسر غلط اور ایسی محبت کے قائلین کو مجرم قرار دیا:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ

مَرْيَمَ --- [المائدة: ٤٢]

”ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ، مسیح بن مریم ہے“۔۔۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَلَاثٌ ثَلَاثَةٌ --- [المائدة: ٤٣]

”ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں تیسرا ہے“۔۔۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عَزِيرُ بْنُ ابْنِ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصْرَى الْمَسِيحُ ابْنُ

اللَّهِ---[التوبة: ۳۰]

”یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور عیسائیوں نے کہا کہ

مسیح اللہ کے بیٹے ہیں“۔۔۔

قرآنِ محبت کے اس تصور کو اس لیے تسلیم نہیں کرتا کہ اس سے اصل مقاصد

حاصل نہیں ہوتے بلکہ دینِ حق کا پیش کردہ نظریہ زندگی ہی درہم برہم ہو جاتا ہے۔۔۔

یہی یہود و نصاریٰ انبیاء کے ساتھ محبت کے اس غلط تصور کے بعد اس نتیجے پر پہنچے

کہ ہم سب اللہ کے پیارے اور اس کے فرزند ہیں۔ لہذا ہمیں آخرت کی فکر سے

کیا غرض؟۔۔۔[۱]

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصْرَى نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَ

أَحِبَّاءُهُ---[المائدة: ۱۸]

”یہودیوں اور عیسائیوں نے کہا کہ ہم تو اللہ کے بیٹے اور اس کے

پیارے ہیں“۔۔۔

اور سورہ بقرہ میں ان کا یہ دعویٰ مذکور ہوا کہ:

وَقَالُوا لَنْ نَمَسَّنَا النَّارَ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً---[البقرة: ۸۰]

”اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں آگ نہ چھوئے گی سوا چند دنوں کے“۔۔۔

[۱]..... عیسائیوں کا توصاف عقیدہ ہی یہ ہے کہ حضرت مسیح سولی پر چڑھ کر اپنی امت کے

گناہوں کی بخشش کرا گئے ہیں۔۔۔

آپ نے غور کیا کہ محبت کی ذرا سی لغزش انسانوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔۔۔ [۱]
اب یہ یہودی اور عیسائی انبیاء کو خدا کا بیٹا پکار پکار کر اپنے زعم میں یہ سمجھے ہوں گے
کہ ہم ان کی خوش نو دی اور رضا حاصل کر رہے ہیں، لیکن درحقیقت ان انبیائے کرام کی
ارواح مقدسہ ان کے جاہلانہ و ظالمانہ تصورات سے بیزار ہیں اور قیامت کے دن
ان کی یہ جاہلانہ محبت ان کے منہ پر دے ماری جائے گی۔۔۔

لہذا اسلاف (خواہ شہید ہوں، خواہ اللہ کے دوسرے نیک بندے) سے محبت رکھنے
اور ان کی یاد منانے کا اسلامی طریقہ وہی ہو سکتا ہے، جو قرآن حکیم کی ہدایت کے مطابق ہو۔
قرآن حکیم بہت سے انبیائے کرام اور صالحین کی زندگیاں اور ان کی قوموں کے
حالات بیان فرماتا ہے۔ مگر ان میں سے صرف وہی چیزیں سامنے لاتا ہے، جن کا تعلق
ان انبیاء کی تعلیمات، ان کے اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ اعمال کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کے بعد
تمام جغرافیائی اور تاریخی یا محض ظاہری اور سبھی قسم کی چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے۔۔۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محبت کے لائق ان کی سیرت اور ان کی پاکیزگی ہے
اور یاد رکھنے اور ذکر کرنے کے قابل ان کے اصول اور ان کی تعلیمات ہیں۔
قرآن حکیم نے شہداء کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کی یاد منانے کا اصول بھی بیان فرمایا ہے،
چوں کہ ہمارا اصل مقصد یہی ہے کہ شہداء کی یاد منانے کا اسلامی طریقہ معلوم کیا جائے،
اس لیے یہ مسئلہ پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آنا چاہیے۔۔۔

[۱]..... جب محبت کا تصور غلط ہو گیا تو یاد باقی رکھنے کا طریقہ خود بخود غلط اور جاہلانہ
ہو کر رہ گیا۔ یعنی یہ تو میں انبیاء کی مورتیاں اور مجسمے بنا کر ان کی پوجا میں مصروف ہو گئیں،
اسلام نے اسی لیے تصویر بنانے سے منع کر دیا کہ کہیں مسلمان قوم بھی انبیاء و صلحاء کی
تصویریں اور شبیہیں بنا کر ان کی عبادت نہ شروع کر دیں۔ اسلام نے اسلاف کی
یاد منانے کے لیے وہ طریقے دیے ہیں، جن سے ان نیک بندوں کی سیرت، ان کی تعلیمات
اور ان کا مشن زندہ ہو، نہ کہ ایسی رسمیں جو انسان کو شرک اور جہالت کے غار میں گرا دیں۔۔۔

یاوشہداء اور قرآن

قرآن حکیم نے سورہ بقرہ میں شہداء کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ مَّ بَلْ أَحْيَاءٌ
وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ --- [البقرہ: ۱۵۴]

”اور جو اللہ کی راہ میں قتل ہوں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں،

لیکن تم نہیں جانتے“ ---

شہادت کا ایک رخ یہ ہے کہ وہ شہید کے لیے اور اس کی قوم کے لیے ایک
غیر فانی اعزاز ہے ---

اور دوسرا رخ یہ ہے کہ شہید کے پس ماندگان کے لیے یہ رنج و الم اور گہرے
حزن و ملال کا موقع بھی ہے۔ وہ بیباں جن کے شوہر شہید ہو جائیں، وہ بیٹے جن کے باپ
اللہ کی راہ میں کام آ جائیں اور وہ باپ جن کے فرزند دشمن کی تلوار کا نشانہ بن جائیں،
کس قدر دکھتے، سکتے اور آہیں بھرتے ہیں۔ لیکن قرآن حکیم اس موقع پر مرد مومن کے لیے
ایک نرا لاکر دار بتلاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں تمہیں مال، پیداوار، جان اور اولاد
غرضے کہ ہر پیاری چیز سے آزمایا جاتا ہے اور آزمایا جائے گا، لیکن تم نے صبر و استقلال کا
اعلیٰ نمونہ پیش کرنا ہوگا ---

چنانچہ شہداء کے ذکر کے بعد ساتھ ہی دوسری آیت میں فرمایا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ
الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا
أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ

رَاجِعُونَ ۝ --- [البقرہ، ۱۵۱-۱۵۲]

”اور ہم تمہیں خوف، قحط، جان و مال اور پیداوار کے نقصان سے ضرور آزمائیں گے اور صبر کرنے والوں کو بشارت سنادو، جو مصیبت کے وقت کہتے ہیں، بے شک ہم اللہ کے ہیں اور ہم نے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے“ ---
ان آیات سے صاف معلوم ہوا کہ جس قوم کے کچھ افراد اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں یا اسی طرح کوئی دوسری آزمائش آجائے تو انہیں صبر و رضا کا نہایت اعلیٰ کردار پیش کرنا چاہیے۔ شہداء کے پس ماندگان کو یہ بات کبھی زیب نہیں دیتی کہ وہ اللہ کی راہ میں جان دینے والوں کی لاشوں پر جاہلانہ انداز کی آہ و فغاں بلند کریں ---

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ جب جنگ صفین سے واپس لوٹے تو شہر کی گلیوں سے کچھ عورتوں کی آواز سنائی دی، جو میدان جنگ کے مقتولین پر بین کر رہی تھیں، تو آپ نے اس وقت ارشاد فرمایا [۱]:

أَتَغْلِبُكُمْ نِسَاءً كُمْ عَلَىٰ مَا أَسْمَعُ إِلَّا تَنْهَوْنَهُنَّ عَنْ هَذَا

الرَّئِیْنِ؟ --- [نہج البلاغہ، صفحہ ۱۲۲۹، مطبوعہ تہران]

”کیا تمہاری عورتیں تمہارے قابو میں نہیں، یہ میں کیا سن رہا ہوں،

[۱]..... اسلام میں یہ اصول رسول اللہ ﷺ نے اس وقت قائم فرمایا تھا، جب آپ ﷺ جنگ احد سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے اور عربوں کے دستور کے مطابق بین کرنے والی عورتیں آپ ﷺ کے دروازے پر جمع ہو گئیں۔ جب ان کے رونے پینے کی آواز حضور ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ باہر نکلے اور فرمایا:
”بس تمہارا شکر یہ اسلام میں نوجہ کرنا منع کیا گیا ہے“ ---

اسی واقعہ کا دوسرا حیرت انگیز حصہ یہ ہے کہ جب بھائی کی شہادت کی خبر سن کر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا میدان میں پہنچیں اور بھائی کی کٹی ہوئی لاش کو دیکھا، تو شہیدوں کے سردار کی شیر دل بہن کے منہ سے بس اتنا نکلا: انا لله وانا الیہ راجعون ---
واقعی بندہ مومن کا مقام صبر ایسی ہی شان دکھاتا ہے ---

کیا تم انہیں اس رونے پٹینے سے منع نہیں کرتے“۔۔۔

شہید، جو اعلیٰ قسم کا قومی کردار ادا کر کے دنیا سے رخصت ہوتا ہے، اس کردار کے ایک حصے کی تکمیل پس ماندگان کے طرز عمل پر موقوف ہوتی ہے اور وہ یہی ہے کہ جن کا کوئی عزیز خدا کی راہ میں خنجر ستم سے ذبح کیا گیا ہو، وہ اس کی غم انگیز یاد میں اسی صبر و ثبات کا راستہ اختیار کریں، جس کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود شہید مغفور دنیا سے روانہ ہوا۔۔۔

جو لوگ اس کی راہ پر چلتے ہیں، وہی حقیقت میں شہید کے مشن کو سمجھتے ہیں۔ لہذا وہ اللہ کے ہاں اپنے طرز عمل کا ثواب پائیں گے، جیسا کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک ساتھی سے فرمایا تھا:

يَا أَشْعَثُ! إِنْ صَبَرْتَ جَرَىٰ عَلَيْكَ الْقَدْرُ وَأَنْتَ

مَاجُوسٌ۔۔۔ [نہج البلاغہ، صفحہ ۱۲۱]

”اے اشعث! اگر تم صابر رہو تو تم پر تقدیر اس حالت میں گزرے گی

کہ تم ثواب پانے والے ہو گے“۔۔۔

لیکن جو لوگ صبر و ثبات کا دامن چھوڑتے ہیں، وہ نہ شہید کے نصب العین کو سمجھتے ہیں اور نہ اس کے نقش قدم پر چلتے ہیں، لہذا وہ اجر و ثواب سے محروم رہتے ہیں۔ حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا [۱]:

وَمَنْ ضَرَبَ عَلِيَّ فِخْذِهِ عِنْدَ مُصِيبَةٍ حَبِطَ أَجْرُهُ۔۔۔

[نہج البلاغہ، صفحہ ۱۱۴۳]

”اور جو شخص مصیبت کے وقت اپنی ران پر ہاتھ مارتا ہے، اس کا ثواب

ضائع ہو جاتا ہے“۔۔۔

[۱]..... اور آپ کا یہ فرمان حضور ﷺ کی حدیث مبارک سے مستفاد ہے، جس میں فرمایا:

”جس نے گریبان پھاڑا، چہرہ پیٹا اور جہالت کی باتیں کیں وہ ہم میں سے نہیں“۔۔۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات سے بڑھ کر اس امت کے لیے غم کی اور کیا منزل ہو سکتی ہے، لیکن دیکھیے اس موقع پر بھی مرد مومن کا کردار کیا تھا۔ جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سرکارِ دو عالم ﷺ کو غسل دے رہے ہیں اور ساتھ فرماتے جا رہے ہیں:

”اے آقا و مولا! یہ صدمہ جان کاہ تو ایسا ہے کہ اگر آپ نے صبر کا حکم نہ دیا ہوتا اور جزع فزع سے روکا نہ ہوتا، تو ہم آنکھوں کا پانی ختم کر دیتے اور ہمیشہ رنج و غم کی محفلیں لگائے رہتے۔“

نہج البلاغہ میں ہے:

قَالَهُ وَهُوَ يَلِيُّ غُسْلَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَتَجْهِيْزَةَ أَبِي وَ
 أُمِّي يَا رَسُولَ اللَّهِ (صَلَّى اللَّهُ عَلَيْكَ وَسَلَّمَ) لَقَدْ انْقَطَعَ
 بِمَوْتِكَ مَا لَمْ يَنْقَطِعْ بِمَوْتِ غَيْرِكَ مِنَ النَّبُوَّةِ وَالْأَنْبَاءِ وَأَخْبَارِ
 السَّمَاءِ..... وَلَوْلَا أَنَّكَ أَمَرْتِ بِالصَّبْرِ وَنَهَيْتِ عَنِ الْجَزَعِ
 لَنَفَدْنَا عَلَيْكَ مَاءَ الشُّيُوْنِ وَ لَكَانَ الدَّاءُ مِمَّا طَلَا---

[نہج البلاغہ، صفحہ ۷۲۳]

”جب حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے غسل اور تجہیز و تکفین میں مصروف تھے، تو اس وقت آپ نے کہا:

”اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیک وسلم) آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں، آپ کی وفات سے وہ چیزیں منقطع ہو گئی ہیں، جو کسی اور کی موت سے منقطع نہیں ہوئی تھیں۔ یعنی نبوت، عالم غیب کی خبریں اور آسمان کی باتیں اور اگر آپ نے صبر کا حکم نہ دیا ہوتا اور جزع فزع سے نہ روکا ہوتا، تو آپ پر ہم آنکھوں کا پانی ختم کرتے اور یہ درد و غم نہایت طویل ہو جاتا۔“

معلوم ہوا کہ فرزند ان اسلام نے اپنے محبوب آقا ﷺ کے وصال پر بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا تھا اور ثابت کر دیا تھا کہ مسلمان دنیا کی جاہل قوموں کی طرح جذبات کے جوش سے مغلوب نہیں ہو جاتا، بلکہ وہ زندگی کی راہوں میں جگر پاش صدمات کے موقع پر بھی اپنے بلند ترین اصولوں پر قائم رہتا ہے۔۔۔

خود شہزادہ خاندان رسالت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ میدان کربلا کے خیمے میں اپنے گھرانے کی پاک خواتین کو جو وصیت فرما رہے تھے، وہ شہید اور اس کے پس ماندگان کے لیے اسلامی طرز عمل کی وضاحت کر دیتی ہے۔ محرم کی دسویں رات کو تلوار صاف کرتے ہوئے، آپ نے چند عربی اشعار پڑھے، جس پر حضرت سیدہ زینب رضی اللہ عنہا پر آب ہو گئیں۔۔۔

حضرت امام رضی اللہ عنہ نے اسی وقت اپنی غم گسار بہن کو خطاب کرتے ہوئے تسلیم و رضا کی لاثانی وصیت ارشاد فرمائی، کہ مبادا جوش غم میں ان سے کوئی بات صبر کے منافی ہو جائے۔ فرمایا:

اتَّقِيَ اللَّهَ وَتَعَزَّيْ بِعِزِّ اللَّهِ وَاعْلَمِي أَنَّ أَهْلَ الْأَرْضِ
يَمُوتُونَ وَأَهْلَ السَّمَاءِ لَا يَبْقُونَ وَأَنَّ كُلَّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَ
اللَّهِ، أَبِي خَيْرٍ مِنِّي وَ أُمِّي خَيْرٌ مِنِّي وَ أَخِي خَيْرٌ مِنِّي وَ لِي وَ
لَهُمْ وَ لِكُلِّ مُسْلِمٍ بِرَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ يَا أُخِيَّةُ! إِنِّي أَقْسِمُ
عَلَيْكَ لَا تَشْقِي عَلَيَّ جَبِيًّا وَلَا تَخْمِشِي عَلَيَّ وَجْهًا وَلَا تَدْعِي
عَلَيَّ بِالْوَيْلِ وَ الثُّبُورِ إِنْ أَنَا هَلَكْتُ --- [کامل ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۳۰]

”بہن! تقویٰ الہی پیش نظر رکھو، اللہ ہی کے نام سے تسکین حاصل کرو اور جان لو کہ نہ زمین والے باقی رہیں گے، نہ آسمان والے اور ذات خداوندی کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ میرے باپ مجھ سے بہتر تھے، میری ماں مجھ سے

بہتر تھیں اور میرے بھائی مجھ سے بہتر تھے۔ میرے لیے، ان کے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات ہی نمونہ ہے۔۔۔

اے میری پیاری بہن! میں تمہیں قسم دیتا ہوں، مجھ پر گریبان نہ پھاڑنا، چہرہ نہ نوچنا اور اگر میں شہید ہو جاؤں تو مجھ پر نوحہ اور بین نہ کرنا۔۔۔

یہی وصیت [۱] جلاء العیون (مصنفہ ملا باقر مجلسی) میں ان الفاظ کے ساتھ درج ہے:

زیںہار! کہ دست از شکیبائی بردارید و کلام ناخوشے بر زبان میارید کہ موجب نقص ثواب شما گردد۔۔۔ [جلاء العیون، صفحہ ۴۰۸]

”یاد رکھنا کہ دامن صبر نہ چھوڑنا اور کوئی نامناسب کلمہ زبان پر نہ لانا، جو تمہارے ثواب کی کمی کا باعث بن جائے۔۔۔“

ان تمام اقتباسات کو سامنے لانے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اس حقیقت سے واقف ہو سکیں کہ ہمیں کیسے اعلیٰ، پاکیزہ اور مثالی کردار کی تعلیم دی گئی ہے۔ لیکن آج ہم کن خود ساختہ رسموں میں مبتلا ہو کر رہ گئے ہیں؟۔۔۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ قرآن حکیم، رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور ائمہ اطہار کے

[۱]..... جلاء العیون میں وہ وصیت بھی نقل کی گئی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی سیدہ زہراء جنت رضی اللہ عنہا کو کی تھی:

ابن بابویہ بسند معتبر از حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ روایت کردہ است کہ رسول خدا ﷺ در ہنگام وفات حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا گفت، اے فاطمہ! چوں بمیرم روئے خود برائے من مخراش و گیسو پریشاں مکن، و او یلا مگو و نوحہ گراں را مطلب۔۔۔ [جلاء العیون، صفحہ ۶۵]

”ابن بابویہ نے حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ سے سند معتبر کے ساتھ روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے وصال کے وقت حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

اے فاطمہ! جب میرا انتقال ہو جائے تو میرے لئے چہرہ نہ نوچنا، بال نہ بکھیرنا، آہ و فغاں نہ کرنا اور نوحہ گروں کو نہ بلانا۔۔۔“

اس قدر واضح ارشادات موجود ہونے کے باوجود غلط قسم کی رسمیں کیوں کر اختیار کر لی گئیں؟ ---

اس کا جواب نکہت شاہ جہاں پوری کے خیال کے مطابق یہ ہے کہ یہ سارا سلسلہ سیاسی مقاصد کے ماتحت معرض وجود میں لایا گیا تھا، وہ لکھتے ہیں:

”بقول ابن کثیر، شامی بحوالہ پروفیسر براؤن صفحہ ۳۱، یہ رسم محرم ۳۵۲ھ سے ۹۶۳ھ تک بغداد میں مروج رہی، اس سے پہلے دنیائے اسلام ان رسومات سے ناواقف تھی۔ سب سے پہلے معز الدولہ احمد بن بویہ نے محرم کی دسویں تاریخ کے لیے یہ حکم دیا کہ اس تاریخ کو تمام افراد سیاہ لباس پہنیں اور بازاروں کو بند کر کے سید الشہداء حضرت امام حسین ؑ کی تعزیت میں مشغول رہیں۔ چوں کہ پہلے سے بغداد میں یہ قاعدہ مروج نہ تھا، اس لیے اہل سنت نے اس کو بدعت خیال کیا مگر چوں کہ معز الدولہ کے خلاف کچھ نہ کر سکتے تھے، اس لیے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس کے بعد خاندان دیالمہ کی شیعہ حکومت نے محرم کے دس دن تمام شہروں میں اسی تعزیت کے لیے مقرر کر دیے۔ چنانچہ یہ رسم طغرل سلجوقی کی ابتدائی حکومت تک قائم رہی اور اس کے اثرات اب تک باقی ہیں۔ ---

اولاً یہ رسوم اور روضہ خوانی، نوے اور بین زیادہ تر سیاسی مفاد پر مشتمل رہے ہیں، پھر رفتہ رفتہ مطلع سیاست صاف ہو جانے پر کہیں تو حقیقی سوز و گداز اور کہیں صرف رسم پرستی رہ گئی۔ مختار کی شورش یا سیاسی تحریک اور عباسیوں کی سلطنت کا سنگ بنیاد بھی انتقام حسین ہی کے نام سے قائم کیا گیا تھا، بلکہ یوں سمجھیے کہ ان دونوں تحریکوں کی فتح مندی اسی میدان کر بلا کی مرہون ہے۔ لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ ان سیاسی یا مذہبی شورشوں کے بانی اصحاب نے حق پرستی پر کبھی عمل نہیں کیا، بلکہ مذہب کے پردہ میں سیاسی مفاد ہی

اکثر مد نظر رہا۔۔۔

اس کش مکش کا انجام یہ ہوا کہ دنیاۓ اسلام میں دو طبقے پیدا ہو گئے، جو اپنے اپنے دعوؤں کے ساتھ ہمیشہ برسر پیکار رہے۔ مسلمانوں کی بدبختی سے اب بھی یہ دونوں برسر پر خاش رہتے ہیں، ظاہر ہے کہ اب نہ وہ مسئلہ خلافت و میراث اور نہ وہ عباسی و اموی سلطنت، یا یوں سمجھیے کہ بے ملکی نواب کی طرح اسلام کے شیرازہ کو خود درہم برہم کر رہے ہیں، کاش۔۔۔ ع

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

[از حسین بن علی، صفحہ ۱۱-۱۲]

میرا مدعا طنز و تعریض نہیں، بلکہ اس بات پر افسوس ہوتا ہے کہ محرم کی آمد پر ہمارے ہاں کشیدگی بڑھتی ہے اور اس میں خود ساختہ رسموں کو دخل ہے۔ جب ماتمی جلوس والے سنی آبادی کے علاقوں میں سے گزرتے ہیں تو ان کے جوش میں اضافہ ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں فریقین میں کشیدگی ابھرتی ہے اور کئی مقامات پر ناخوش گوار واقعات بھی پیش آتے ہیں۔ حالاں کہ یہ رسمی سلسلہ کوئی ضروری چیز نہیں، بلکہ اسلامی ہدایات کے منافی ہے۔ لہذا اگر اس کی بجائے محرم میں بڑے بڑے اجتماع اور عظیم کانفرنسیں منعقد کی جائیں تو یہ ملک و ملت کی سلامتی اور وحدت کے لیے بہت مفید ثابت ہوں۔۔۔

ان اجتماعات میں ملک کے سلجھے ہوئے فضلاء مدعو کیے جائیں، جو آج کے راہ گم کردہ کاروان امت کو شہنشاہ اقلیم شہادت سیدنا امام حسین ؑ کا پیغام حق و صداقت سنائیں، ان کی عدیم المثال قربانی کے حقیقی مقاصد پر روشنی ڈالیں اور ان کی سیرت عالیہ کے ابدی خطوط مسلمانوں کے سامنے رکھ کر اس بھولی ہوئی قوم کو وحدت ملی کے فلسفے سے آگاہ کریں:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کا شغریں

سانحہ کربلا، اقبال کی نظر میں

اسلامی تعلیم اور اسلامی تاریخ دونوں کی صحیح تفہیم، سیاسی بصیرت کے بغیر ناممکن ہے، کیوں کہ اسلام بہر حال انسان کے اجتماعی اور سیاسی امور کو خارج از دین قرار نہیں دیتا۔ چنانچہ اسلامی تعلیمات کے ہر جزو میں انفرادی اور اجتماعی پہلو ساتھ ساتھ سمونے ہیں۔ اس طرح کا امتزاج اسلامی تاریخ میں بھی پایا جاتا ہے۔ آپ اسلامی تاریخ کو محض چند شخصیتوں کے عروج و زوال کی داستان قرار دے کر اس کی گرہیں ہرگز نہیں کھول سکتے، بلکہ حق و باطل کی آویزش اور اسلام اور جاہلیت کی کش مکش کا پس منظر ذہن میں رکھتے ہوئے ہی

ابر رحمت بن کراٹھے:

خاست آں سر جلوۂ خیر الامم

چوں سحاب قبلہ باراں در قدم

”اس موقع پر وہ شخصیت جس میں خیر امت کی خودداری مرکز ہو گئی تھی،

قبلہ کی سمت سے آنے والی بارش سے بھرپور گھٹا بن کراٹھی“۔۔۔

بادل اور بارش کی طبیعت تو یقیناً فیض رساں ہوتی ہے، لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ

جس زمین پر بارش برسے، وہ اپنی شوریدگی کی بنا پر بارانِ کرم کے اثرات قبول کرنے سے

محروم رہ جاتی ہے۔ غالباً سرزمین عراق کی اس محرومی کی طرف اقبال اشارہ کرنا چاہتے تھے:

بر زمین کربلا بارید و رفت

لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت

”یہ بارش کربلا کی زمین پر برسی اور چلی گئی، یہ بارش ویران اور بنجر خطوں میں

لالہ کاری کر کے روانہ ہو گئی“۔۔۔

تاہم خونِ شہید، قوموں کی تاریخ میں کبھی رائیگاں نہیں گیا، اس موجبِ حق نے

آمریت کے چہرے پر وہ زنائے دارتھڑ رسید کیا کہ وہ طویل اور طاقت ور ہونے کے باوجود

اپنے چہرے پر طرح طرح کے نقاب ڈالتی رہی اور قاہر و غالب ہونے کے باوصف

مسلمانوں کے دلوں میں اپنا کوئی مقام نہ بنا سکی۔ نیز ملوکیت کے دیواستبداد کے

رقصِ مجنونانہ سے سانحہ کربلا کے رونما ہونے اور سیدنا امام حسین ؑ جیسے مقدس و عزیز

انسان کے شہید ہو جانے سے اسلامی تاریخ میں یہ حقیقت ثابت ہو گئی کہ فردِ واحد

کے ہاتھوں میں ریاست کا سب اقتدار مرکوز ہو جانا، دنیائے سیاست کا بدترین جرم ہے۔

یوں شہادت امام حسین ؑ، دنیا کی ساری تاریخ میں آمریت کے خلاف ایک منفرد احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے، جس نے آمریت کے حق میں سیاسی، شرعی اور اخلاقی، کسی طرح کا کوئی جواز باقی نہیں رہنے دیا:

تا قیامت قطع استبداد کرد

موج خون او چمن ایجاد کرد

”سیدنا حسین ؑ نے قیامت تک کے لیے استبداد (کے جواز) کی

جڑیں کاٹ کر رکھ دیں اور اپنے خون کی موجوں سے خودداری و حق پرستی کا

ایک چمنستان پیدا کر دیا“---

آپ نے اپنے دور کی عظیم عسکری قوت کے دباؤ اور دھمکی کے باوجود اعلائے کلمہ حق

کا فریضہ ادا کیا۔ اس سے آپ نے یہ سمجھایا کہ اسلامی ریاست میں فوجی طاقت

اس لیے مضبوط بنائی جاتی ہے کہ اس سے دین کو تقویت اور سر بلندی حاصل ہو،

اس لیے نہیں کہ برسر اقتدار خاندان یا فرد اسے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے پر صرف کرے۔

جب کوئی حکمران تلوار کو آئین ریاست کے تحفظ کے بجائے اپنے ذاتی جاہ و اقتدار کی

تعمیر و حفاظت کا ذریعہ بنا لیتا ہے تو وہ میرت فاروقی سے ہٹ کر فرعونیت کی راہ پر

چل نکلتا ہے، جب کہ مرد مومن، دین اور آئین کی تیغ عادل کا احترام کرنا تو جانتا ہے

لیکن وہ فرعون کی تلوار کے سامنے سر جھکانے کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔ مرد حق کے

کردار عظیم کی تفسیر حضرت امام حسین ؑ نے اپنے پاکیزہ خون سے لکھی:

تیغ بہر عزت دین است و بس

مقصد او حفظ آئین است و بس

ما سوی اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیش فرعون نے سرش اٹکندہ نیست
خون او تفسیر این اسرار کرد
ملت خوابیدہ را بیدار کرد

”اسلامی ریاست کے سربراہ کے ہاتھ میں تلوار اس لیے دی گئی کہ وہ
دین کی سر بلندی اور آئین خداوندی کی حفاظت کرے، بندہ مومن، غیر خدا کا
کبھی پجاری نہیں بن سکتا اور اس کا سر کسی فرعون کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوتا،
حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت نے ان اسرار کی تشریح کرتے ہوئے
سوئی ہوئی قوم کو بیداری کا پیغام دیا۔“

جب وقت کے فرعون ”انا سابقکم الہلی“ کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو مردان حق
لا الہ کی شمشیر جو ہر دار لے کر ان کا ”لا غیر“ کا زعم باطل توڑ دیا کرتے ہیں:

تیغ ”لا“ چوں از میاں بیروں کشید
از رگ ارباب باطل خون کشید

”جب آپ نے لا الہ کی تیغ براں نیام سے باہر نکالی تو اہل باطل کی

رگوں میں خون خشک ہو گیا۔“

اگرچہ امویوں نے شام میں، عباسیوں نے بغداد میں اور دور عثمانی کے امویوں نے
غرناطہ میں مستحکم اور وسیع حکومتیں قائم کیں، جن کے بعض ایام میں اسلامی تہذیب
فروغ پذیر ہوئی اور علوم و حکم اسلامی اوج کمال پر پہنچے، لیکن ان حکمرانوں کے ضمیر سے
ملوکیت اور موروثی سلطنت کے جراثیم نہ نکلے۔ اس لیے اقبال کہتے ہیں کہ ملت کے

خوددار شعور نے اپنی تاریخ کے اس آمرانہ دور کے جاہ و جلال کو فراموش سا کر دیا:

شوکتِ شام و فر بغداد رفت

سطوتِ غرناطہ از ہم یاد رفت

”مملکت و مشق کی شان و شوکت اور بغداد کی پر شکوہ رونق سب جاتی رہی،

نیز غرناطہ کی عظمت کے افسانے بھی بھلا ڈالے گئے“---

اس کے برعکس جو کارنامہ حضرت امام حسین ؑ نے انجام دیا وہ اگرچہ ایک لمحہ کا

عمل تھا، لیکن چوں کہ وہ روحِ اسلامی کے عین مطابق تھا، اس لیے ملوکیت کی ہزار سالہ تاریخ

کے مقابلہ میں وہ اہل ایمان کے نزدیک زیادہ وقیع و عزیز ہے اور اس کی یاد

سرمایہ ایمان و یقین ہے:

تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز

تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز

”ہمارے شعور ملی کے تار، مضرابِ حسینی کی ضربات سے ابھی تک

تموج پذیر ہیں اور ہمارے ایمان کی تازگی ان تکبیروں کی گونج سے ہے“---

آخر میں دیدہ بینائے قوم نے اس امتِ مرحوم کے دور افتادگان کی طرف سے

حضرت سیدنا امام عالی مقام ؑ کی تربت پاک پر سلام بھیجا ہے:

اے صبا اے پیک دور افتادگان

اشک ما بر خاک پاک او رساں

”اے صبا! دور افتادگانِ غربت کے لیے تو ہی قاصد ہے، ہمارے آنسو

اس مقدس انسان کی لوحِ خاک تک پہنچا دے“---

امت کی اس دور افتادگی میں اقبال کا اشارہ اس خلیج کی طرف ہے جو صدیوں کی
قیصر نوازی اور شاہ پرستی کے باعث اس امت اور حضرت امام ؑ کے درمیان
حائل ہو چکی ہے۔ دجلہ و فرات کی وادی آج بھی اس ابر کرم کی محتاج ہے۔



جانشین حضرت فقیہ اعظم

صابر الہیٰ مجتہد محکمات اللہ الہدیٰ اور صحیحہ

کی ایمان افروز نگارشات

تصانیف

- رحمۃ للعالمین ﷺ کا پیغام امن
- گستاخ رسول کا شرعی حکم
- ظہور نور مصطفیٰ ﷺ
- میلاد النبی ﷺ - صاحب میلاد کی کرم نوازیوں
- جس سہانی گھڑی چکا طیبہ کا چاند
- رفعت شان رفعتا لک ذکرک
- افضلیت مدینہ منورہ
- ارمغان محبت (نعتیہ کلام)
- اسلام اور تصوف
- مخزن صدق و صفا - سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ
- باب مدینۃ العلم - مرتضیٰ مشکل کشا، مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم
- حب اہل بیت
- بلال با کمال رضی اللہ عنہ
- حضرت فقیہ اعظم کے استاذ مکرم مفتی اعظم سیدی ابوالبرکات اپنے مکاتیب کے آئینے میں
- روز عطا لک لکھو لکھو
- (خوش الوری، بحیثیت مظہر مصلحتی)
- سلطان الہند خواجہ خواجگان معین الدین چشتی اجمیری رضی اللہ عنہ
- شہنشاہ ولایت حضرت شیخ شکر رضی اللہ عنہ
- بہشتی دروازہ
- امام بخاری رحمہ اللہ الباری
- حضرت عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ
- استاذ ابوالقاسم القشیری رضی اللہ عنہ
- امام ابن کثیر رضی اللہ عنہ
- امام عبدالوہاب شمرانی رضی اللہ عنہ
- صاحب دلائل الخیرات رضی اللہ عنہ
- حضرت بابا جی ابوالنور محمد صدیق رضی اللہ عنہ
- فقیہ اعظم - پیکر شفقت
- وقت کی قدر کیجئے

فتاویٰ نوریہ (جلداول، دوم ترتیب نو۔۔ جلد سوم تا ششم تدوین و تہذیب)

○ خطبات نوریہ ○ سترہ تقریریں ○ میلاد النبی ﷺ ○ روز عطا لک لکھو

ترتیب و تدوین

تراجم

ISBN 969-9079-22-3



978 969 9079221 >

قیمت = 150 روپے

فقیہ اعظم پاکستان کی کیشنر بصیرت لوری (اوکارا)